بستیاں

(افسانوی مجموعہ)

مصنف

جوگندر پال

اردو اکادمی دہلی

بستیاں

(افسانوی مجموعہ)

مصنّف

جوگندر پال

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۲۳

BASTIAN
(COLLECTION OF SHORT STORIES)
Author
Joginder Pal
Pub.by
URDU ACADEMY, DELHI
Print
2000 A.D.
Rs.50.00

ضابطہ

سن اشاعت
۲۰۰۰ء

پچاس روپے

اصیلا آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریاگنج، نئی دہلی ۲

اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریاگنج، نئی دہلی

ISBN: 81-7121-126-7

تیرا

ہی

تیرا

فہرست

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پاکر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہوگئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور

بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر افسانوی مجموعہ جناب جوگندر پال کی نئی کہانیوں پر مشتمل ہے، جسے انھوں نے ہماری گزارش پر ترتیب دیا ہے۔

جناب جوگندر پال کا شمار اردو کے اُن گنے چنے باکمال ادیبوں میں ہوتا ہے جو ہمارے افسانوی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کو فن کی اُن بلندیوں تک پہنچایا ہے جو کسی بھی زبان کے لیے سرمایۂ افتخار ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بڑے تخلیق کار کے فرائض سے کبھی غافل نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ہر نئی پیڑھی کے ادیبوں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی ہے، انھیں اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا درس دیا ہے، انھیں فن کے رموز اور تخلیقی اظہار میں زبان کے اُتار چڑھاؤ سکھائے ہیں۔ ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ جناب جوگندر پال کا یہ افسانوی مجموعہ ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

منصور احمد عثمانی

سکریٹری

پیش لفظ

بسے ہوئے لوگ

میرے ناول کے ہیرو اور ہیروئن دونوں مجھ سے ناراض تھے، کیونکہ جب ان کی شادی کے اسباب آپ ہی آپ عین فطری طور پر انجام پا رہے تھے تو میں نے ان کا بنا بنایا کھیل چوپٹ کر دیا اور اپنی ترجیحوں کو ناول پر لاد کر انہیں آخری صفحے تک ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر اڑا رہا۔

مگر وہ دونوں تو موقع کی تاک میں تھے۔ ایک دن نظریں بچا کر اچانک غائب ہو گئے۔ میں نے ناول کے مسودے کی ایک ایک سطر چھان ماری اور ہر مقام پر انہیں اپنے ناموں کی اوٹ میں ڈھونڈتا رہا، مگر وہ وہاں ہوتے تو ملتے۔

مجھے بڑا پچھتاوہ محسوس ہونے لگا۔

اگر وہ مجھے کہیں مل جاتے تو فوراً ان کا نکاح پڑھوا دیتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟...... میں منہ سر لپیٹ کر پڑ گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ کئی سال بعد ایک دن وہ دونوں بہ اتفاق مجھے اپنے ہی شہر میں مل گئے۔

نہیں، وہ مجھے بڑے تپاک سے ملے اور اپنے گھر لے گئے۔

میرے ناول کے پنوں سے نکلتے ہی انہوں نے اپنی شادی کی تدبیر کر لی تھی۔ اور اتنے سال بعد اب تین پھول جیسے بچوں کے ماں باپ تھے اور ان کا گھر بار خوب آباد تھا۔

نہیں، انہیں اپنے دکھ سکھ میں اس قدر پھلتے پھولتے پا کر مجھے حوصلہ ہی نہ ہوا کہ اُنہیں اپنے ناول میں لوٹ آنے کو کہتا۔

گھات

رات کافی ہو چکی تھی۔

ان کی وین مہاتما گاندھی مارگ کی چکا چوند میں سے گزر رہی تھی کہ جگت نے بائیں بغل میں ایک اندھیری سی گلی کی طرف اشارہ کر کے اپنے چھوٹے بھائی بھگت سے کہا۔ "اس گلی میں موڑلو۔"

"میری مانو تو دھندے سالے کو اب کل پر چھوڑ دو۔" مال کی لگاتار تلاش میں انہوں نے دارو پینے کے لئے بھی دم نہیں لیا تھا۔ "وقت پر دوا بھی نہیں پی۔ سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ گلی دیکھ لیتے ہیں۔ یہاں بھی مال نہ ملا تو اگلی سڑک پر پہلے کھا پی لیں گے۔"

بھگت گاڑی گلی میں موڑنے لگا مگر دو نوجوان راستہ روک کر نشے میں کھڑے کھڑے لڑکھڑا رہے تھے۔

بھگت نے گاڑی کو جھٹ بریک لگا دیا اور دونوں بھائیوں نے انہیں سننے کے لئے کان کھڑے کر لئے۔

"نہیں، اسی گلی سے چلیں گے۔" ایک نوجوان دوسرے سے بہ اصرار کہہ رہا تھا۔

"نہیں، پی کر روشنی میں چلنا اچھا لگتا ہے۔" وہ اپنے ساتھی کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گیا اور اس کا ساتھی اسے گالی بکتے ہوئے اس کے پیچھے۔

بھگت نے اپنے بھائی کو ایک معنی خیز کہنی ٹھونکی مگر اس سے پیشتر کہ جگت اسے ان کا پیچھا کرنے کی ہدایت کرتا، پہلو کے سینما گھر کی بھیڑ چھوٹ کر اچانک سڑک کی پٹری پر

بر آمد ہوئی اور کئی لوگ اسی جانب قدم اٹھانے لگے جدھر وہ دونوں نوجوان جا رہے تھے۔

"بڑا سنہرا موقع ہاتھ لگا تھا۔" جگت سوچ رہا تھا کہ کیا اب بھی ان کا پیچھا کرنا مناسب رہے گا۔ "اب کیا کر سکتے ہیں؟"

"کیوں؟ اب بھی۔ وہ دیکھو۔ وہ ہماری آنکھوں کی زد سے باہر نہیں۔"

"نہیں، اب تم اس اندھیری گلی میں ہی گاڑی لے جاؤ۔ قسمت میں کمائی لکھی ہے تو کرنی والا یہاں بھی کچھ کر دکھائے گا۔"

"کرنی والا بے چارہ کیا کرے۔" بھگت نے تھراٹل دبا کر گاڑی کالی گلی میں گھما دی۔

"جب تم ہی کچھ نہیں کرتے؟"

"آہستہ چلاؤ۔"

"تم سب کچھ آہستہ ہی کرتے ہو، اس قدر بے کھٹکا، کہ سمجھ میں آ جانے پر بھی بھوت سے بنے سمجھ سے باہر ہی کھڑے رہتے ہو۔" بھگت اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ "اسی لیے میں تم پر بھروسہ نہیں کرتا۔"

"اچھا، اب بولو مت، اور اپنی طرف پٹری پر نظر جمائے رکھو۔ شاید کوئی سویا پڑا ہو۔"

"کوئی مل بھی گیا تو کوئی فائدہ نہیں۔ تم جیسا زیادہ سوچنے والا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"سوچنا پڑتا ہے بھگتے۔"

"نہیں، جگتے، غلط کام سوچے بغیر ہی ہو جائیں تو ہوتے ہیں۔ گھڑی والا چوک کتنا سنسان پڑا تھا اور وہ لڑکا شراب کباب کے لالچ میں آپ ہی آپ ہماری گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔"

سڑک پر پڑا کوئی کتا وین کے نیچے آ کر بے تحاشہ چیخنے لگا۔

"ہت تیرے کی! اب اس حرام خور کو بھی اسی وقت گاڑی کے نیچے آنا تھا۔"

"گھبراتے کیوں ہو جگتے؟ کتوں کی چیخوں پر کون اپنی نیند خراب کرتا ہے؟"

جگت کی عقابی آنکھیں کسی ٹارچ کے مانند جلتے ہوئے گلی کی دونوں پٹریوں پر جمی ہوئی تھیں کہ شاید کسی کونے میں کوئی بھکاری وکاری سویا پڑا ہو اور وہ اسے سوتے میں ہی بے ہوشی کی ٹیکہ لگا کر اپنی گاڑی میں لاد لے۔ وہ ٹیکہ لگانے میں اتنی مہارت حاصل کر چکا تھا کہ سوئے ہوئے کو زیادہ سے زیادہ یہی لگے کہ مچھر نے کاٹا ہے اور وہ ہاتھ مار کر گہری نیند میں اتر جائے

اور جاگتے ہوئے کو؟...... جاگتے میں تو ہر شخص چپ چاپ درد سے بلبلا رہا ہوتا ہے اور بے ہوشی کا انجکشن اس کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔

ایک بار دور پار کے رشتے کا ایک بھائی ان دونوں بھائیوں کے یہاں آپھنسا تھا۔ کوئی کالا چور تھا۔ چوری کا مال سمیٹ کر کہیں گر پڑا تھا اور کراہتے ہوئے اپنا زخمی وجود ان کے دروازے پر گھسیٹ لایا تھا۔ ٹیکہ تو جگت نے اسے بڑی نیک نیتی سے اس لئے لگایا تھا کہ بے ہوش ہو کر اسے اپنے درد سے ذرا آرام مل جائے مگر اس کے بے ہوش ہوتے ہی وہ اسے بھائی کی بجائے مال دکھائی دینے لگا تھا وہ اپنے آپ کو بتانے لگا تھا کہ اتنا بڑا مال اب آپ ہی آپ اپنے آپ کو ہماری جیبوں میں ٹھونس رہا ہے تو ہم سالے کیا کوئی مہاتما گاندھی ہیں اور...... پھر یہ بھی تو تھا کہ جتنی مالیت کا وہ خود آپ تھا، اتنا ہی وہ چرا کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اپنے بھائی کو سوچوں میں لٹکتے پا کر بھگت کا ماتھا ٹھنکا تھا، پھر معاملے کی تہہ پر پہنچ کر اس نے کہا تھا۔ ”یار تو ہے تو بڑا بے رحم، پر کام اگر کرنا ہے تو سوچے بغیر جھٹ سے کر دو۔“

جگت مال کو بے ہوش کرتا تھا اور گولی بھگت داغا کرتا تھا، چنانچہ اپنے بڑے بھائی کا اشارہ پا کر بھگت نے اپنا بے آواز پستول نکال لیا تھا اور ایک ہی گولی سے اس کے رشتے کے مامے کے بیٹے کی سہمی ہوئی روح اپنا بے ہوش وجود وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

”ہاہاہا۔ ہا۔۔!۔۔ کیوں؟“ بھگت نے معرکہ سر کر کے اپنے بھائی کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”پر پاگلا، اپنے ہی خاندان کا آدمی تھا۔“

”اسی لئے تو اس پر اپنا حق تھا جگتے۔“

”تو پھر میری بھی خیر نہیں بھگتے۔ اس حساب سے تو اپنے سگے بھائی پر تمہارا حق اس سے بھی زیادہ ہے۔“ اس نے گھبرا کر اس سے کہا تھا۔ ”مجھے تو تم سے ڈر لگ رہا ہے بابا۔“

”ہاہاہا!ہا!“

”اونگھنے لگے ہو جگتے؟“ وہ بدستور اندھیری گلی میں سے گزر رہے تھے کہ بھگت نے اپنے بڑے بھائی کو چپ سادھے پا کر اپنے خون میں نہ معلوم کیا سازش محسوس کی۔ ”اپنے آپ کو انجکشن تو نہیں دے دیا؟...... ہا۔ ہا۔ ہا......!“

”نہیں!“ جگت نے اسے پرے دھکیل کر خوف سے آنکھیں پھیلا کے گھورا کہ کہیں

اس کے بھائی کی نیت...... مگر وہ ہنس دیا۔ ''آج کل ہماری قسمت ہی ساتھ نہیں دے رہی۔''

''قسمت تو ساتھ دے رہی ہے بھائی۔'' بھگت نے گاڑی کے اگلے بائیں کھٹکا سا ہونے پر رفتار اور کم کرلی۔ ''...... اوہ! پھر کتا ہے! میں پوچھتا ہوں بھگتے، گلی کے باہر وہ دونوں تمہارے مامے لگتے تھے جو انہیں جانے دیا؟''

''تمہاری جلد بازی ایک دن ہمیں سولی پر چڑھادے گی۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔ ''ہمارے دھندے میں بڑی ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا ہے، ایسے کہ مرنے والے کو بھی مرنے سے پہلے اپنی موت کی خبر نہ ہو۔''

''ہاہاہا! جو مر گیا اسے کیا ہمارا سور گیہ باپ بتائے گا تم زندہ نہیں رہے؟''

''بس ہمیشہ اپنی ہی ہانکتے چلے جاتے ہو......''

''ان شرابیوں سے پہلے وہ بے وقوف چھوکرا تو بھوک سے اندھا ہو کر آپ ہی ہماری گاڑی میں آبیٹھا تھا۔'' بھگت نے اسے یاد دلایا۔ ''وہ تو کہہ رہا تھا، کھلانے پلانے کا وعدہ کرتے ہو تو جہاں چاہو لے جاؤ، مگر تم ہی بوکھلا کر بار بار پوچھے جارہے تھے، کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''......

''ہاں، یار، اسے واقعی بالکل ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے ایک دم اس پر ترس آنے لگا۔''

''تم سوچ سوچ کر ترس کھانے والے پاکھنڈی بڑے لوبھی اور ظالم ہوتے ہو۔''

''تم بہت منہ پھٹ ہو گئے ہو بھگتے۔ کسی دن سو رہے ہو گے تو سوئے سے تمہارا منہ سی دوں گا۔''

''میں پوچھتا ہوں، وہ چھوکرا کیوں ڈرتا؟ وہ تمہیں بتا تو رہا تھا، میرے پاس اپنے سوا ہے ہی کیا جو ڈروں؟''

''ہاں بھائی مورے پر غریب بے چارہ کیا جانے، کہ جب چاہے، اپنے ننگے پنڈے کے بیس پچیس ہزار نقد کھرے کرلے؟''

''تم مورکھ ہو بھائی، مال خود آپ مال کا مالک نہیں ہوتا۔ ہاہا! مال کا مالک وہ ہوتا ہے جس کے ہتھے مال چڑھ جائے۔'' بھگت نے فیصلہ کیا کہ گاڑی کو تھوڑی دیر ایک طرف روک لیا جائے۔

''کھڑی کیوں کر رہے ہو؟''

"اس لئے کہ اس اندھیرے میں اس وقت تو اندھیرے کے یا ہمارے سوا کوئی نہیں۔ شاید پانچ دس منٹ میں کوئی قسمت کا مارا آ نکلے۔" اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر لی۔ "پھر یہ بھی ہے کہ تم صرف اندھیرے میں تیر چلا سکتے ہو۔ اندھیرے سے باہر تو تمہارے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں۔" اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ "مزہ تو تب ہے کہ سب کے سامنے اپنا کام کرو اور کسی کو نظر نہ آؤ۔"

"کیا تم ہمارے سورگیہ باپ کے بارے میں سوچ رہے ہو جو سارا دن اپنی دکان پر بیٹھے کسی کو نظر نہ آتا اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آتا؟...... کیا؟"

"نہیں، میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہ دونوں شرابی نوجوان......"

"نہیں، بھگتے، پہلے مجھے دھیان سے سن لو۔"

"تمہیں بے دھیانی سے سن کر بھی یہ حال ہے۔" اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ "کہ رات کے گیارہ بجے تک کوئی چڑیا کا بچہ بھی قابو میں نہیں آیا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں چلتی سڑک میں تھے، اور دوسری، کہ تمہارے وہ اتنے سارے باپ جو اچانک نکل آئے تھے۔"

"دیکھو جگتے، مجھے کچھ بھی کہہ لو، پر میری ماں کو گالی مت دو۔"

"میری بھی وہ کوئی چاچی مامی تو نہ تھی۔" جگت کو اپنی چھوٹے بھائی پر غصہ آنے لگا۔

"نہیں، اکثر تم مجھے اپنے سگے بھائی معلوم نہیں ہوتے۔"

جگت اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ "تو کیا معلوم ہوتا ہوں؟ بولو، کیا معلوم ہوتا ہوں؟" اس کے غصے میں خوف گھلنے لگا۔ "کوئی شکار؟"

"ہاہاہا۔۔ ہا!"

"ہنسو مت!"

"کیوں، کیا یہاں سوئے ہوئے کتے بلیوں سے بھی ڈر لگ رہا ہے؟"

اسے کوئی جواب دینے کی بجائے جگت سڑک پر آگے پیچھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی اِدھر اُدھر سے گلی میں نکل آیا ہو۔ وہ!...... وہاں!

بھائی صاحب، آپ کے پاس ماچس ہے؟

ہاں! یا راہ گیر نے شاید نہیں کہا ہے۔ یا شاید وہ جگت کے تیور بھانپ کر بھاگنے کی سوچ

رہاہے، مگر اتنے میں بھگت نے اس کی پشت سے کود کر اسے چت کر دیا ہے اور جگت نے اس کے بازو میں فوراً انجکشن کی سوئی کھبو دی ہے اور پھر وہ دونوں اپنے شکار کو گھسیٹ کر وین میں لے آئے ہیں اور پھر...... ٹھا!...... ٹھا کی آواز سن کر جگت اچھل پڑا۔ "کیا تم نے اپنے پستول کا سائیلنسر اتار رکھا ہے؟"

"نہیں! کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" جگت نے دیکھا کہ وہ دونوں توجوں کے توں ٹانگیں پسار کر یہیں وین کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"ہاہاہا!" بھگت ایک دم کوئی سوچ آنے پر ہنسنے لگا۔

"اب کیا ہوا ہے؟"

"مجھے اس عورت کا خیال آگیا ہے...... کیا نام تھا اس کا......؟ تم اسے بہن، بہن کہہ کر پچکارتے رہے اور موقع ملتے ہی اسے بے ہوش کر کے گھر لے گئے، مگر جب میں نے اس کا ٹکٹ کاٹنے کے لئے پستول نکالا تو تم ہاتھ جوڑ کر میری سماجت کرنے لگے۔" بھگت نے اپنے بھائی کی نقل اتار کر کہا۔ "نہیں، بھگتے، بڑی سوادی شے ہے، رات کی رات مجھے چکھ لینے دو، صبح تمہاری آنکھ کھلنے سے پہلے، پھر سوئی چبھودوں گا۔"

"مگر تمہارے سر خون سوار ہو جائے تو تم سنتے تھوڑا ہی ہو۔"

"تم ہی تو کہا کرتے ہو، کام میں صرف کام!"

"وہ بھی تو تم بگاڑ دیتے ہو۔" جگت کو مزید انتظار سے الجھن ہونے لگی۔ "چلو، اگلی سڑک پر کہیں گاڑی روک کر پہلے کچھ کھا پی لیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ تو کوئی بات ہوئی نا!"

بھگت نے گاڑی آگے بڑھائی تو جگت سوچنے لگا کہ پچھلے کئی روز سے ڈاکٹر کو مال نہیں ملا۔ ایسے ہی ہوتا رہا تو وہ کب تک منہ دیکھتا رہے گا اور پھر میں کس سے مٹھیاں بھر بھر کے مردوں کے دام وصول کروں گا؟ اسی ڈاکٹر نے مجھے انجکشن اور سوئیاں اور بھگت کا پستول اور پستول کا سائیلنسر اور...... اور کیا نہیں جو مہیا نہیں کر رکھا ہے۔ وین کا قرض بھی مجھے ڈاکٹر کی گارنٹی اور سفارش پر ہی ملا ہے...... تم بس جی لگا کر کام کرتے رہو جگت رام، میں تمہیں اپنا گھر بنانے کے لئے قرضہ بھی دلوادوں گا، تاکہ ساری عمر آبرو اور آرام سے کاٹ سکو۔

اپنا گھر ہوگا تو کتنے آرام سے بسر ہوگی! ڈاکٹر جب مردے کی آنکھیں، گردے، دل اور نہ جانے کیا کیا نکال کر گوشت اور ہڈیوں کا تودہ سالوٹا دیتا ہے تو ہم دونوں اسے دفنانے کے لئے بھاگتے پھرتے ہیں۔ اپنا گھر ہوگا تو میں وہیں ایک بہت بڑا کچا آنگن بنوالوں گا۔ بس اک ذرا سا گڑھا کھودو اور گوشت اور ہڈیوں کا تودہ اس میں پھینکو اور اوپر وہی کھودی ہوئی مٹی ڈال دو اور...... کام ختم! اور پھر...... آؤ بھگت، آج میں بہت خوش ہوں۔ آج جتنی چاہو، پیو...... نہیں، بھگت، مجھے اور مت دو۔ میں آخری دم تک ہوش میں رہنا چاہتا ہوں۔ مگر آخری دم تو اسی وقت بیت گیا تھا جگت، جب ہم نے پہلی لاش ڈاکٹر کے سپرد کی تھی۔ اب ہوش دوش کیسا؟ لو پیو!

"اپنے آپ کو پھر انجکشن لگالیا ہے؟" بھگت گاڑی کو گلی سے نکال کر بدھ مارگ میں لے آیا تھا۔ "کوئی اپنے بھائی کی جان کیسے لے سکتا ہے جگتے؟ مگر کسی کو...... ہاں، تمہیں بھی اس طرح غافل پاکر میری انگلیاں آپ ہی آپ پستول کو ٹٹولنے لگتی ہیں...... ہاہاہا! کبھی کچھ کر بیٹھا تو مجھ پر الزام نہ دھرنا۔ ہاہا! پر تم رہو گے ہی نہیں تو الزام کیسے دھرو گے؟ ہاہاہا!"

جگت اپنے بھائی کو بٹ بٹ دیکھنے لگا۔ بھائی ہی ہے، پر جس کے دل ہی نہ ہو، وہ بھائی کیا اور نا بھائی کیا؟...... کیوں نہ کبھی کسی رحم دل آدمی کو گولی مار کر ڈاکٹر کو دے آؤں تاکہ وہ اس کا دل بھگتے کے سینے میں فٹ کردے؟...... یا...... یا پھر بھگتے کی ہی گرم گرم لاش کسی دن ڈاکٹر کو سونپ آؤں؟ نہیں، آخر بھائی ہے۔ پر بھائی بھلا اپنے بڑے بھائی سے اس طرح پیش آتا ہے؟

"ہاہاہا...... ہا!"

جگت کا جی چاہا کہ اپنے قہقہاتے بھائی کا گلا دبوچ لے اور اس کے قہقہے واپس اسی کے پیٹ میں لڑھک کر جا چھپیں۔

"میرا خیال ہے جگتے، بھگوان بے چارے کے پاس امریکیوں کی طرح کوئی سپوتنک نہیں، ورنہ جن لوگوں کو ہم اوپر بھیج چکے ہیں ان میں سے کوئی تو لوٹ کر ہمارے گریبان پکڑتا۔"

نصف شب ہونے کو آرہی تھی مگر مہاتما بدھ ابھی تک اپنی تیسری آنکھ کھولے ہوئے تھے، جس باعث بدھ مارگ نور میں نہا رہا تھا، اور رین کے کرمچاری اکیلے یا جھنڈوں

میں بٹ کر اس مانند آجارہے تھے جیسے سورج کے طلوع پر کام پر نکلے ہوئے ہوں۔

ایک، دو، تین، چار...... بھگت راہ گیروں میں سے ایک ایک کو گننے لگا اور جگت کی طرف منہ کر کے بولا۔ "دیکھو، ڈھیروں مال ہے۔ ذرا حساب کر کے بتاؤ، ڈاکٹر سے ان سبھوں کا کتنا پیسہ وصول ہو سکتا ہے۔ ہاہا! مگر کیا فائدہ؟ تم تو ایک ہی سوئی چبھو کر اپنی یار ترکھنی کے کنڈی کواڑ کی طرف نکل پڑتے ہو۔"

جگت ہنس پڑا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر سبھوں کے مردے ڈاکٹر کے پاس ایک دم پہنچاؤ گے کیسے؟" جگت نے پوچھا۔ "وہ تمہاری جورو کا یار صاف صاف بتا چکا ہے، لاش کو اسی وقت نہ لا سکو تو مت لاؤ۔ ذرا بھی دیر ہو جائے تو گردے، آنکھیں، دل، انگ انگ مٹی ہو جاتا ہے۔"

"جگتے، ٹھونک بجا کر کوئی اچھی سی عورت دیکھو اور اب میری شادی کر دو۔"

"ایسی کوئی مل جائے تو میں خود ہی کیوں نہ اسے گھر میں ڈال لوں؟"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے، تمہاری کیا اور میری کیا؟"

"نہیں، تمہاری، تمہاری اور میری، میری۔" جگت نے اسے جواب دیا۔ "پر تم بھی کوئی نہ کوئی ڈھونڈ ضرور لو۔ اسی لئے تم اتنے ظالم ہو کہ عورتوں سے دل لبھانے کی بجائے بس ایک شراب چڑھائے جاتے ہو۔"

بھگت نے کسی مناسب جگہ پر پارکنگ خالی پا کر سرعت سے اسٹیئرنگ ادھر گھما دیا اور دھچکے سے وین وہاں کھڑی کر دی۔

"اب؟"

"اب کیا؟ پیچھے جا کر وہسکی اور کھانا اٹھا لاؤ۔"

"پیچھے ہی کیوں نہ جا بیٹھیں؟"

"ہاں، یہی بہتر ہے۔ چلو۔"

وین کے پچھلے حصے سے سیٹیں اٹھا دی گئی تھیں۔ نیچے فرش پر غالیچہ بچھا ہوا تھا اور ایک طرف الماری نما لکڑی کا ڈھانچہ نصب تھا جس میں انہوں نے اپنی ضرورت کی اشیا جما رکھی تھیں، یہی چند برتن، نمک مرچ، ساس، شراب اور سوڈے کی بوتلیں، کھانے کا ڈبہ اور پھل وغیرہ۔ غالیچے پر کوئی لاش نہ بچھی ہوتی تو بعض اوقات اس چلتے پھرتے مکان میں ان

دونوں میں سے ایک یہیں آکر بچھ جاتا اور دوسرا ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے اسے گویا جہنم پہنچانے جا رہا ہوتا۔

جگت غالیچے پر آرام سے بیٹھ گیا اور بھگت اس کے ساتھ بیٹھنے سے پہلے الماری سے وہسکی کی بوتل، سوڈا، کھانے کا ڈبہ اور پلیٹیں وغیرہ نکال کر اس کے سامنے رکھنے لگا۔

"ہا۔ ہا۔ ہاہا۔ ہا!۔"

جگت اپنے ہاتھ دھونا روک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اب کیا ہوا ہے؟ تمہیں کوئی الٹی سیدھی سوجھتی ہے تو قہقہے چھوڑنے لگتے ہو۔"

"سوجھنا کیا ہے بھائی؟ دنیا ہمیں بے وجہ غریب سمجھتی ہے۔" وہ پلیٹیں اور گلاس بھی رکھ کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "جس ملک میں لاکھوں کی بے آئی موت پر کروڑوں بن مانگے پیدا ہوتے رہیں، کیا وہ عربوں سے بھی امیر نہ ہو گا؟"

"مگر غریب تو ہم ہیں بھگتے۔"

"تم موٹی عقل کے آدمی ہو۔ اس نے گلاسوں میں بڑے بڑے پٹیالہ پیگ بھرے اور دانتوں سے سوڈے کا ڈھکنا کھول کر اسے وہسکی میں ملانے لگا۔ "صرف ایک سال کے لئے اس ملک کی حکومت مجھے سونپ دو۔"

"چلو سونپی۔"

"پھر دیکھو، کیسے میں ہر شخص کو اس کی پوری قیمت ادا کر کے اسے سیدھے سیدھے اس سے خرید لیتا ہوں اور ملک کے سارے ڈاکٹروں کو بس اسی ایک کام پر لگا دیتا ہوں کہ انسانی ڈھانچوں کو ان کے سارے بکاؤ پرزوں سے خالی کر دیں اور انہیں فسٹ کلاس سائنسی پیکنگ میں ایکسپورٹ کرتے رہیں۔ یورپ اور امریکہ میں آدم کے انگوں کی مارکیٹ ہماری اناج منڈیوں سے بھی بڑی ہے۔ ملک کی بہتری کے لئے ڈالر پہ ڈالر کماتے جاؤ...... چیئرز!" وہ جلدی جلدی اپنا گلاس خالی کر کے اپنے لئے ایک اور پٹیالہ تیار کرنے لگا۔ "کیوں، کیسی کہی؟ ہمارے لوگ تو یوں نہیں تو یوں بھی کسی وبا، فساد، سیلاب یا سوکھے سے مرتے رہیں گے، پھر یوں ہی کیوں نہیں؟ اپنی پوری قیمت وصول کر کے مریں اور مرنے کے بعد بھی مزے سے امریکہ اور یورپ والوں کے گورے پنڈوں میں دیکھیں، دھڑکیں اور موج اڑائیں۔"

"چلو، اب زیادہ باتیں نہیں بناؤ۔" جگت نے طے کر رکھا تھا کہ آج خواہ ساری رات

بھٹکنے میں گزر جائے وہ مال پر ہاتھ صاف کئے بغیر دم نہ لیں گے۔" جلدی سے کھاپی لو۔رام تلائی کے موڑوں میں ضرور کوئی سویا پڑا مل جائے گا۔"

"ہہ ہاہہ!"

"اب کیا؟......"

"رام تلائی میں ہی تو وہ پگلی گونگی ہمارے ہاتھ لگی تھی...... ہہ ہاہہ!......ہم دونوں نشے میں دھت تھے۔ہاں،اور تو اور، تم بھی!...... اس پر گولی داغ دینے کے بعد ہم اسے یہاں غالیچے پر لٹا چکے تھے اور سارے کام سے فارغ ہو کر لاش کے پہلو میں بیٹھ گئے تھے کہ تھوڑی اور پی کر اسے ڈاکٹر کے حوالے کر آئیں گے۔"

"ہاں، تمہاری باتوں میں آکر میں اکثر بنا بنایا کھیل چوپٹ کر دیتا ہوں۔"

"میری باتوں میں تم کہاں آتے ہو؟ کوئی دس منٹ کے بعد ہی تم نے اپنی رٹ شروع کر دی تھی، چلو، پہلے لاش کو ڈاکٹر کے حوالے کر آئیں۔ اگر گرم گرم ہی تمہارے باپ کے پاس نہ پہنچائی تو وہ ہمیں ہی گولی مار کر آپریشن کے کمرے میں گھسیٹ لے جائے گا......

"بھگت نے اپنا گلاس خالی کر کے منہ میں نمکین بھر لیا اور قہقہہ جو لگانا چاہا تو نمکین منہ سے باہر اچھل آیا...... "ہہ ہاہہ!...... تم نے اپنا لیکچر ابھی پورا نہیں جھاڑا تھا کہ گونگی کی لاش گوں۔گوں چیختی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور وین کے کھلے دروازے میں سے کود کر دوڑ گئی تھی۔" وہ اپنا ایک اور گلاس تیار کرنے لگا۔"میری سمجھ میں آج تک نہیں آسکا کہ پگلی پر نہ تمہارے انجکشن نے کام کیا، نہ میری گولی نے......؟" وہ پلیٹ سے مرغے کی ایک ٹانگ اٹھا کر اسے بھوکے کتے کی طرح دانتوں سے نوچنے لگا۔ "کیسے؟"

"کیسے کیا؟ نشے میں تم نے اپنی گولی ہوا میں چلادی ہو گی اور میں نے سوئی اس کے بازو سے نکال کر تین چوتھائی دوا باہر خارج کر دی ہو گی۔"

"مگر تم بڑے عقلمند بنے پھرتے ہو۔"

"مگر رہتا تو بے وقوف کے ساتھ ہوں۔"

"نہیں جگتے؟ قصہ یہ ہے کہ نشے میں کسی کو مارنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔" اس نے اپنا گلاس پھر منہ سے لگالیا۔"تم بہت تھوڑی پیتے ہو، اس لئے جب بھی سوچتے ہو، کسی کی جان لینے ہی کی۔"

"چلو، اب پینا چھوڑو اور کھانا کھاؤ۔ ہمیں ابھی رام تلائی جانا ہے۔" اس نے نان کے ایک بہت بڑے نوالے میں انڈوں کی بر جی لپیٹ کر منہ بھر لیا اور گلاس کو اٹھانے کی سوچنے لگا۔ "رام تلائی کیوں؟ یہیں سے کسی کا منہ باندھ کر اسے وین میں گھسیٹ لائیں گے۔"

"نہیں! کئی بار بتا چکا ہوں ہمارے کام کے یہی اکا دکا لوگ ہیں جو فٹ پاتھ پر سوتے ہیں اور جنہیں اٹھالے جائیں تو ان کا کہیں کوئی انتظار نہیں کرتا۔"

"ارے! پھر تو میں بھی تمہارے کام کا ہوں۔ میرا بھی کون کہاں انتظار کر رہا ہے۔" اس نے جلدی سے گلاس اٹھا کر غٹ غٹ خالی کر دیا۔ "تم سے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں میری کہیں شادی کروادو۔ میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں، اپنی بیوی سے بچے پیدا کرنا چاہتا ہوں...... نہیں، میں اب کسی کو مارنا نہیں چاہتا، صرف پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

بھگت نے پھر اپنا گلاس بھرنا چاہا، مگر جگت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں، اور نہیں۔ جلدی سے کھانا کھاؤ۔ ابھی سارا کام باقی پڑا ہے۔"

"کام وام کچھ نہیں۔ میں نے کہانا، یہیں سے کسی کو پکڑ لیں گے اور ڈاکٹر سے کہیں گے، گرم گرم لاش مانگتے ہو، لو، اپنے ہی ہاتھ سے گولی مار کر لے جاؤ۔" وہ اپنا خالی گلاس ہونٹوں پر الٹا کر منہ میں شراب کے قطرے ٹپکانے لگا۔ "ابھی میرا من نہیں بھرا۔"

"نہیں، ہر گز نہیں!" جگت اڑ گیا۔

مگر بھگت نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے گلاس میں وہسکی انڈیل لی۔

"تم جانتے ہو بھگتے، ڈاکٹر کیا چاہتا ہے۔ اس نے سختی سے کہہ رکھا ہے، جسے بھی لاؤ باہر سے جان لے کر لاؤ، مرنا مارنا تمہارا کام ہے۔"

"نہیں۔" بھگت نے وہسکی میں سوڈا ملا کر کئی گھونٹ تیز تیز حلق سے اتار لئے۔ "میں اب کسی کو نہیں ماروں گا۔ او، کے؟ یہ دھندا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا...... او، کے؟"

"اچھے کی بری اولاد!" بڑے بھائی کو غصہ آنے لگا۔ "تنگ مت کرو اور اٹھو۔ آج بھی مال سپلائی نہ کر سکے تو ڈاکٹر ہماری چھٹی کر دے گا۔"

"بول دیانا، نہیں!...... نہیں!"

بڑے بھائی کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"چلو، اسی دم اٹھو!"

"نہیں!"

"چلو گے، یا......"

"یا کیا؟...... مجھے بھی سوئی چبھو دو گے؟" نشے کی حالت میں بھگت اپنے بڑے بھائی کے پہلو میں الٹا لیٹ گیا۔ "ہمت ہے تو چبھوؤ!"

اور تعجب کی بات ہے کہ بڑے بھائی نے دانت پیستے ہوئے اپنی جیب سے دوا سے لبالب بھرا ہوا سرنج نکالا اور اس کے بازو میں گھسو کر خالی کر دیا۔

اب کیا کروں؟

مگر جو اسے کرنا تھا وہ تو انجانے میں اس کے ذہن میں طے پا چکا تھا۔

عقب

نہیں، ڈاکٹر، نہیں! میں نے اپنی یادداشت نہیں کھوئی ہے۔ پہلے میری سن لو، تمہیں یقین آجائے گا۔ مجھے تو پیدائش سے ہی بعینہٖ سب کچھ یاد ہے...... بلکہ اس سے بھی پہلے سے، جب میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا...... ہنسو مت، ڈاکٹر، میری ماں مجھے اِس طرح ساتھ لیے پھرتی تھی گویا بہ دستور اپنے وجود کے اندر ہی سنبھالے ہوئے ہو۔ رہنے سہنے کو گھر نہ ہو تو ماں اپنے بچے کو بطون میں سلا کر خود آپ باہر باد و باراں میں پڑ جاتی ہے...... ہمارا گھر؟...... ہاں، اگر تھا تو ہو گا ہی...... ٹھہرو، پہلے مجھے اپنی کہانی جوڑ لینے دو۔ جینا اگر مر مر کے ملا ہو تو پچھلے جنموں کو یاد کیے بغیر کہانی نہیں جڑتی۔ پھر بھی میرے سگے سمبندھی دعویٰ کرتے ہیں کہ میری یادداشت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا...... میں اپنے باپ کی موت کے بعد پیدا ہوا...... نہیں، میں اسے نہیں جانوں گا تو اور کون جانے گا؟...... نہیں، ڈاکٹر، اُس کی موت کے بعد پیدا ہوا تو کیا ہوا؟ اُس کی روح تو جسدِ خاکی سے نکلتے ہی ماں کی کوکھ میں سیدھی میرے اندر آگھسی تھی۔ ماں بھی کہا کرتی تھی میں ہو بہو اپنا باپ ہوں...... پھر ہنس رہے ہو؟...... نہیں، واقعی خود آپ ہی اپنا باپ ہوں۔ نہ ہوتا تو ہوتے ہی مر مٹ گیا ہوتا۔

ہاں، گھر تو تھا، مگر گھر تو گھر والوں کا ہوتا ہے۔ ماں تو کرائے کی کھولی میں رہا کرتی تھی اور کرایہ ادا کرنے والا مر چکا تھا...... اب؟...... خوش قسمتی سے میرے باپ کے رشتے کا ایک بوڑھا اور کنوارا چچا ماں کو شہر کے ایک نہایت پرانے گندے مندے محلے میں اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں اٹھا لایا، یہ کہہ کر، چلو بیٹی، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کیا فکر؟...... مگر گھر لانے کے چند ہی ہفتوں بعد وہ اپنا پورا منہ کھول کر بولا، ”لوگوں کا منہ کوئی بند کرنے سے رہا درو پدے، وہ باتیں بنا رہے ہیں۔“

”کیسی باتیں، چچا؟“

"یہی کہ تم اور میں ...... چھوڑو! آؤ، اُن کا منھ بند کے لیے بیاہ کر لیتے ہیں۔"

ماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ جواب میں کیا بولے۔ میں ڈرنے لگا کہ میری مورکھ ماں کہیں اُلٹے سیدھے جواب سے بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے۔ اُس کے پیٹ میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے میں نے رو رو کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور تنبیہہ کی کہ ہامی بھر لے۔ بوڑھا زیادہ سے زیادہ اور پانچ سات سال جی لے گا۔ چل بسا تو آرام سے یہیں ٹکے رہیں گے۔

ماں بھولی تو تھی پر اتنا بُرا بھلا تو سوچ سکتی تھی۔ کہنے لگی، "ٹھیک کہتے ہو منوا۔ باپ تمہارے کو مورا اتنا ہی کھیال ہوتا تو مجھے اِس دشا میں چھوڑ کر چلتا کیوں بنتا؟"

سو جب میری ماں کا بیاہ ہو رہا تھا ڈاکٹر، تو میں بڑا خوش تھا، اتنا مانو اُس کے پیٹ میں الٹا نہیں لٹکا ہوا تھا بلکہ میں ہی سر پر سہرا باندھے اپنی ماں سے بیاہا جا رہا تھا...... ہنس کیوں رہے ہو؟ نہیں، میں پاگل نہیں ہوں۔ میرے گھر والوں نے خواہ مخواہ میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلا رکھی ہیں۔ میں بیمار تو شاید ہوں ڈاکٹر، پر پتا نہیں، دل میں، دماغ میں، یا کہاں؟...... نہیں، ڈاکٹر، میرے بیٹے کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے؟ بڑا میٹھا اور نیک بنتا ہے، مگر صرف بنتا ہے۔ اُس حرامی پلے کو میرے علاج سے کیا غرض؟ وہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم سے میرے پاگل پن کی تائید کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے میری جائداد ہڑپ کر لے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا...... جانتے ہو، کیا؟ پاگل بھی ہوں تو میری بجائے میرا پیسہ ہی مجھے سنبھالے رکھے گا......

اپنی کہانی کی طرف ہی آ رہا ہوں۔ بات باتوں سے پوری ہوتی ہے، صرف قصے کہانی سے نہیں...... ہاں، میری عادت بھی ہے کہ جو سوچ آ جائے اسی دم اس سے منھ بھر لیتا ہوں۔ میرا ایک بڑا وفادار کتا ہوا کرتا تھا ڈاکٹر، گلے میں ہڈی پھنسی ہوتی تھی مگر ہڈی سے گوشت کے ریزوں کو زبان پر گھلتے محسوس کر کے چلانا بھول کر دُم ہلانے لگتا۔ کوئی لحظہ اگر ایک اُسی لحظہ جیا جا سکتا ہے تو آگا پیچھا بھول کر ہنستے کھیلتے صرف اُسے کیوں نہ جی لیا جائے...... کہانی ہی تو بیان کر رہا ہوں...... میری پیدائش پر ماں میری کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا...... میرا مرحوم باپ؟...... نہیں، اپنی خالص، غیر مخلوط خوشی میں ماں کو ایک بار بھی اُس کا خیال نہ آیا...... کیا تم نے اُس بھولی بھالی لڑکی کی کہانی سن رکھی ہے جس کی خالی ہتھیلی میں کسی اجنبی سوداگر نے ایک چمکتی ہوئی اشرفی تھمائی اور یہ جا وہ جا...... نہیں، گھبراؤ نہیں، میں یہ کہانی

سنانے نہیں جارہا۔ مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ جو ہتھیلی میں اشرفی تھما کر چلتا بنا وہ تو گیا، مگر ماں کی پر مسرت آنکھیں اشرفی کی چمک دمک سے اٹھنے ہی نہ پائیں۔ میں نے جو اُس کی گود میں پڑے پڑے اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑا...... میں تو یہاں پڑا ہوں، وہاں کیسے جا پہنچا؟

بابا؟...... میرے سوتیلے باپ کو ہم سب بابا ہی کیا کرتے تھے...... ہاں، ماں بھی...... اُس بوڑھے نے میری پیدائش پر جیسے زیاں کے احساس سے بے ساختہ کہا ہو گا، کوئی بات نہیں...... اور پھر غلطی کے ازالے کی خاطر میرے نچلے ہونٹ پر اپنی چھٹی ہوئی بدبودار انگلی رکھ کر چھی چھی کر کے مجھے ہنسانے لگا ہو گا۔ اس نے ماں کو یقین دلایا ہو گا، بڑا خوب صورت بچہ ہے۔ سارا تم ہی پر گیا ہے...... ماں کی خوشی اتنی خود سر اور خالص ہو گی کہ اُسے پھر بھی نہ سوجھا ہو گا کہ کچھ نہ کچھ تو اس پر بھی گیا ہے جو رہا نہیں۔

بھائی بہن؟...... بھائی بہن کیسے ہوتے؟ بابا کا سامنا ہونے پر ماں کی آنکھوں میں اُس کا سورگباش بابا گھوم جاتا ہو گا۔ عورت اپنے بابا کے بچے تھوڑا ہی پیدا کرتی ہے۔ بابا کی تو خدمت ہی کی جا سکتی ہے جو وہ جی توڑ کر کرتی اور بابا اسی پر اُس پر ریجھ ریجھ جاتا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے سے نیم تاریک گھر میں میں بابا اور ماں کی آنکھ مچولی دیکھ دیکھ کر اونچا ہوتا چلا گیا اور ساتویں آٹھویں جماعت تک پہنچ کر اتنا اونچا نکل آیا کہ گھر کا دروازہ مجھے تنگ اور چھوٹا معلوم ہونے لگا...... نہیں، اس سارے دوران ماں اور بابا کی آنکھ مچولی میں ماں کبھی بابا کے ہاتھ نہ آئی۔ کئی بار چھپتے چھپاتے مجھے گھر کی ایک تاریک ترپائیں کوٹھڑی میں میرے حساب کے ٹیچر سے جڑ کر بیٹھی دِکھ جاتی۔ وہ دونوں مجھے اچانک وارد ہوتے ہوئے پا کر گھبرا سے جاتے۔ کلاس میں ہم سب لڑکے اُس ٹیچر کو گجراتی لعل ٹھرکی کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارے محلے میں ہی رہتا تھا۔ مجھے مفت ٹیوشن پڑھانے آیا کرتا تھا اور پڑھاتے ہوئے میرے گال چٹکیاں بھر بھر کے لال سرخ کر دیتا تھا، اور بہانے بہانے سے مجھے چومنے چاٹنے کے لیے میرے منھ سر پر چڑھ کر پوچھتا تھا، بتاؤ، کسی ہندسے کو صفر سے ضرب دینے پر کیا جواب آتا ہے؟

نہ، نہ، ڈاکٹر، میری ماں کو برا مت کہو۔ ماسٹر گجراتی لعل کے سوال کا یہی تو جواب آتا ہے۔ ماں اپنے وجود پر صفر کی جمع یا تفریق تو بار بار کیا کی، مگر وجود کو صفر کی ضرب سے

ہمیشہ بچائے رکھا۔ اُس نے جنس کی تسکین کے لیے کبھی کچھ نہ کیا۔ کچھ کرپانے کے لیے جنس کو ضرورت کی طرح برتنے سے پرہیز نہ کیا...... تم یقین نہیں کرو گے ڈاکٹر، اپنی جنسی تسکین تو وہ اپنے شوہر کی بیٹی بن کر اُس کی خدمت گزاری سے کرلیتی تھی۔ وہ بڑی پاک طینت تھی۔ ہر روز صبح گیتا کا پاٹھ رٹتی تھی اور بھگوان کرشن سے پورن ہردیہ سے پرارتھنا کرتی تھی، ایسی لاج رکھیو جیسی دروپدی میا کی رکھی تھی۔ اُس کی پرارتھنا اور نیت اور کرموں کا پھل تھا کہ میں اپنا سنیئر سیکنڈری کا امتحان بڑی ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس کرپایا۔ انگریزی میں سارے بورڈ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ میں نے کالج میں انگلش آنرز میں داخلہ لیا تو وہ محلے بھر میں لڈو بانٹ کر لوگوں کو بتاتی پھرتی تھی، "مورے منوا نے ڈاکڈاری میں داکھلا لیا ہے بہنا۔ بڑا ڈاکڈر بن جائے گا تو تمارا الاج پھوکٹ میں کردیا کرے گا۔"

بابا؟...... ماں کو اتنا پھولا پھولا پاکر بابا بھی بشاشت سے دکھی چلنے لگا تھا، ایک دن بوڑھا بابا جو رات بھر سونے کی نیت سے بستر پر دراز ہوا تو سوتے سوتے ہی اپنا مردہ جسم چھوڑ کر نہ جانے کدھر نکل گیا۔ ماں کو شاید اپنے باپ کے جانے کا اتنا دکھ نہ ہوا ہوگا جتنا بابا کی روانگی کا ہوا، مگر یہ پتا چلنے پر وہ خوشی سے زاروقطار روئی کہ بابا اُس کے لیے بیمے کے پچیس ہزار روپے بھی چھوڑ گیا ہے۔ ہم نے بابا کی دکان بھی دس ایک ہزار میں چکتی کردی اور پھر ماں نے پینتیس ہزار روپے بینک میں میرے نام جمع کروادیے، تاکہ اُس کے سود کے تین سو پچاس روپے ہمیں ہر ماہ ملتے رہیں۔ بابا زندگی میں دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں کماپاتا تھا مگر مرکر وہ ہمارے لیے ساڑھے تین سو کی کمائی کرنے لگا اور ماں جی ہی جی میں اُس کے پیر دباتے ہوئے سوچنے لگی، بھگوان مورے ماتما بابا کو بیکنٹھ میں استھان دے، کتنے موکے کی موت مرا ہے۔ منوا اب اپنی ڈاکڈری پھر پھرپوری کرلے گا...... منوا بیٹا، مو جھے بھل جاؤ تو بھل جاؤ، پر بابا کا کیا کبھی ناں بھلنا۔

مگر چند ہی دنوں میں بابا کو ہم ایسے بھول گئے جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

نہیں، ڈاکٹر، بابا کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہوئی، یا پھر اتنی ہی ہوئی، جتنی اُس نے خود آپ ہی اپنے ساتھ برتی۔ اپنی زندگی کے جن سانحوں کو ہم اپنے حالات کے جبر سے تعبیر کرتے ہیں وہ حالات ہم نے خود آپ ہی پیدا کیے ہوتے ہیں...... نہیں، اُس نے ماں سے اِس لیے شادی نہ کی تھی کہ وہ اُس کا یا اُس کے نام پر کسی اور کا بچہ پیدا کرے اور ماں

اور بچہ اُس کی وفات کے بعد اُس کے نام کی مالا جپتے رہیں۔ اُسے تو ایک خدمت گزار عورت چاہیے تھی جسے آنکھوں میں لٹا کر اُس کے پہلو میں دبک کر پڑ جائے اور ٹھرک پورا کر کے خراٹے بھرنے لگے...... ماں ؟...... ماں کو اس میں کیا عذر تھا؟ اپنے دل میں وہ جو چاہے، کرتا رہے۔ اُسے کیا؟ وہ تو بابا کے پیر دباتے یا ماسٹر گجراتی لعل ٹھرکی کا ٹھرک پورا کرتے ہوئے بھی اپنے دل میں میرا سر تھپکار ہی ہوتی تھی۔

ہاں، میں بھی یہی سوچتا ہوں، بابا نے اپنی زندگی کا بیمہ کیوں کروا رکھا تھا۔ اُس کی پہلی بیوی شادی کے کوئی سوا سال میں ہی مردہ بچہ جن کر اُسی کے تعاقب میں چل بسی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اپنی بیوی کی موت کے بعد اتنے سال وہ آخر کس کے لیے بیمے کا پریمیم ادا کرتا رہا۔ شاید اُسے یقین ہو کہ گھر ہے تو گھر والی تو کبھی نہ کبھی آئے گی ہی۔ اُسے کیا پتا تھا کہ اُس وقت آئے گی جب اُس کے گھر چھوڑنے کا ٹائم آ چکا ہو گا...... ہہ ہاہہ !...... مجھے عجیب سا خیال آیا ہے ڈاکٹر...... ماں بھاگی بھاگی بابا کے پاس آ پہنچی ہے اور یہ عذر پیش کر رہی ہے، میں تو سیدھی تمارے ہی پاس آ رہی تھی پر کیا کرتی، رستے میں میرے کھاوند نے روک لیا...... ہہ ہا!...... جا رہے ہو تو اپنا دھیان رکھنا بابا!......

میڈ اینڈ کروئل ؟...... نو، ڈاکٹر، میرا پاگل پن صرف یہ ہے کہ میں لاعلم نہیں۔ میں ظالم بھی نہیں ہوں اور ہوں تو ویسے نہیں، جیسے تم سمجھتے ہو۔ بربری ظلم تو انسانی ارتقا کے پہلے دور تک ہی چل پایا، جب انسان طبعاً ابھی جانور کی طرح معصوم تھا۔ انسانی سروکار میں سود و زیاں کی موروثی تہذیب نے ہمارے دور کے ظلم کو قاعدے قانون میں ڈھال لیا ہے۔ قاعدے قانون کے جبر نے ہی شیطان کو جنٹل مین بننے پر مجبور کر رکھا ہے اور جنٹل مین کو شیطان...... ہہ ہاہہ ...... ظالم اور مظلوم ہر دو ظلم سہنے اور ظلم ڈھانے پر مجبور ہیں مگر...... ہہ ہا...... کیا معلوم، کون ظلم سہہ رہا ہے اور کون ڈھا رہا ہے ؟...... اپنی حکایت کی طرف لوٹ آؤں ؟...... یہی تو میری حکایت ہے۔ نہایت تحمل اور بردباری سے ظلم سہہ سہہ کر اِس کے سوا مجھے کوئی چارہ ہی نہ رہا کہ موقع ملتے ہی میں بھی ظالم بن جاؤں۔ میرے بیٹے راگھو کو شکایت ہے کہ میں اکثر تشدد پر اتر آتا ہوں۔ شاید اتر آتا ہوں مگر کتنا اور کیسے ؟...... اتنا اور ایسے ہی جتنا اور جیسے قاعدے قانون سے۔ راگھو بھی لاعلم نہیں کہ کسی ضابطے کی پیروی کے بغیر مجھے پاگل قرار نہیں دیا جا سکتا...... نہیں!...... ہاں، شاید وہ مجھے واقعی پاگل سمجھتا ہے،

مگر جب تک میں پاگل ثابت نہ ہو جاؤں مجھے پاگل خانے کے اور میری ساری ملکیت کو اپنے سپرد کیسے کر سکتا ہے؟...... نہیں، ڈاکٹر، میرے ذہن کا تانا بانا ابھی جوں کا توں کسا ہوا ہے۔ اِسی لیے مجھے آس پاس پر غصہ آجاتا ہے۔ اگر میرا ذہن ڈھیلا پڑ چکا ہوتا تو اپنے سوتیلے باپ کی طرح سینائل ہو کر میں بھی چپ سادھے بٹ بٹ دیکھتا رہ جاتا۔ میرا تو یہ ہے کہ چپ سادھ لینے پر میرا چوکس ذہن چیخنا شروع کر دیتا ہے...... ہاں، جیسے کسی غلط اقدام پر تمہارا کمپیوٹر۔ میں اپنے پچھترویں سال میں بھی بہ دستور بڑی جارحیت سے جینا چاہتا ہوں۔

آئی ایم ساری! میں اپنی کہانی کی سیدھ سے پھر باہر آنکلا۔ میں نے کہاں چھوڑا تھا؟...... ہاں، انگلش آنرز...... انگلش آنرز اور ایم اے، انگریزی کے دوران مجھے یونی ورسٹی اسکالر شپ ملتا رہا۔ میری کامیابی کا ایک نمایاں سبب یہ تھا کہ ادب کے حسی خصائص کا اثر قبول کرنے کی بجائے میں اِسے علمی وسائل کے طور پر برتتا رہا۔ اپنے اِسی پیشہ ورانہ رویے کے باعث میں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی اپنی ادبی ساکھ بنالی۔ میری آنکھ یونی ورسٹی لیکچرر شپ پر تھی۔ ایم اے کا نتیجہ نکلتے ہی مجھے یہ جگہ بغیر کسی دوڑ دھوپ کے مل گئی۔ بغیر دوڑ دھوپ کے اِس لیے، کہ یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کا ہیڈ اور پروفیسر سروپ چندر ریٹائرمنٹ سے پہلے اپنی اکلوتی اولاد ششی کی شادی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا اور اشاروں میں کئی دفعہ مجھ سے اپنی اِس خواہش کا اظہار بھی کر چکا تھا...... ششی؟ اُس کے بارے میں بھی بتاتا ہوں۔

ششی کو مجھ سے محبت تھی، نہ نفرت۔ میری طرح اور بھی درجن پون درجن نوجوان اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے جن سے محض خوش وقتی کے لیے وہ ہر پہر کھلے بندوں ملتی تھی۔ شادی کے لیے محفوظ ترین چھاتا شاید وہ ایک مجھے ہی سمجھتی تھی۔ ایک دن میرے ہاتھ میں کھلے ہوئے ارسطو کو چھین کر اس نے پرے پھینک دیا...... ''اِن مردہ بوڑھوں کی کمپنی میں کیوں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہو۔ ہماری عمر مزے لوٹنے کی ہے۔''

''شادی کے بعد مزے ہی تو لوٹیں گے۔''

اُس نے پیر پٹخ کر جواب دیا، ''شادی سے پہلے کیوں نہیں؟''

اُسے لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، پھر بھی اُس نے مجھ سے ایک سال پہلے فرسٹ کلاس لے کر انگریزی میں ہی ایم اے کیا تھا۔ اُس کا باپ خاندانی رئیس تھا۔ لاکھوں کی

جائداد تھی جس کی وہ تنہا وارث تھی، لہٰذا کوئی کام کاج کرنے کی بجائے وہ اپنے آپ کو صرف مصروف رکھتی تھی۔ یعنی جیسے بھی مصروف رہے۔ اپنے دور کے ایک شادی شدہ رشتے دار سے اُس کا چند سال سے باقاعدہ افیئر چل رہا تھا۔ اُس کے باوجود میں اُس سے شادی پر آمادہ ہو گیا...... کیا؟...... کیوں؟...... ڈاکٹر، یہ سوال میں نے بھی اُس وقت اپنے آپ سے پوچھنا چاہا ہو گا اور جواب بڑی ہوشیاری سے گول کر گیا ہوں گا، یا پھر میری باچھیں اتنی کھل گئی تھیں کہ چور وسوسوں کو آپ ہی آپ آڑ مل گئی۔

ماں میری کا کیا پوچھتے ہو ڈاکٹر؟ بیوہ نے خوشی سے باؤلی ہو کر میری منگنی کے دن سے ہی سُوا چیرا اوڑھنا شروع کر دیا اور مکان کی ایک ایک اینٹ کو دھو کر ہمارے بوڑھے بوسیدہ گھر کو بھی نیا نویلا دولہا بنا دیا، مگر شادی کی تاریخ پکی ہوتے ہی ششی نے مجھے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ پھیروں کے بعد ہمیں انہی کے گھر میں رہنا ہے...... پپا کہتے ہیں کہ گھر کے آگے سے تمہاری ڈولی اٹھے گی ششو، اور یہیں گھر کے پیچھے تمہیں جا اتارے گی......

"مگر میری ماں، ششو؟......"

"شادی بیوی سے کر رہے ہو، یا ماں سے؟"

اُس کی بات تو میری سمجھ میں بہ خوبی آ گئی مگر میں یہ نہ سمجھ پایا کہ ماں کو کیسے سمجھاؤں گا، مگر جب کہیں درد ہوتا ہے تو خود بہ خود معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ہو رہا ہے۔ ماں بے چاری دل تھام کر بیٹھ گئی۔

نہیں، ڈاکٹر، ماں کو شادی پر خوشی کیسے نہ ہوتی؟ پر جس نے رو رو کر کاٹی ہو اُسے کیا معلوم خوشی میں خوش کیسے رہا جاتا ہے؟...... نہیں، شادی کے بعد پہلے تو میں ہر روز اُسے ملنے چلا جاتا تھا، پھر ہفتے میں ایک بار، اور پھر بڑی مشکل سے فرصت نکال کر مہینے میں دو ایک بار گاڑی اُدھر موڑ لیتا۔ ہمارے اوائل کے راستے اتنے تنگ کیوں ہوتے ہیں ڈاکٹر، اور وہاں اتنی بھیڑ کیوں ہوتی ہے؟ گاڑی چلاتے ہوئے میری جان پر بن آتی...... میری بیوی کا گھر؟...... نہیں، جہنم کے راستے اتنے فراخ اور ہموار ہوتے ہیں کہ گاڑی فراٹے بھرتی چلی جاتی ہے...... ایک بات بتاؤں؟ اِن راستوں کو اتنا ویران پا کر میں سوچتا کہ جہنمی روحوں کے غول کے غول سڑک کے بیچوں بیچ بھی چل رہے ہوں تو نظر تھوڑا ہی آتے ہیں...... ہاں، کئی جہنمی روحوں کو گاڑی کے نیچے ڈھیر کر کے، یا بھوت ڈھیر ہونے سے بچ گئے ہوں تو اُن کی

خوف زدہ چیخوں سے گدگدی محسوس کر کے تیز تیز نکل جاتا کہ پولیس نمبر نہ نوٹ کر لے۔

ماں کے بارے میں اور کیا بتاؤں؟ ایک دن بھولے سے جو اُس کے یہاں پہنچا اور گاڑی سے مٹھائی کی ٹوکری نکال کر...... میری آمد پر وہ بڑے فخر سے پڑوسیوں میں مٹھائی بانٹا کرتی تھی...... مکان کا رخ کیا تو وہ دروازے پر ہی کھڑی تھی، پر کیا کھڑی تھی۔ وہ تو اُس کی نیک روح نا معلوم کتنے گھنٹوں سے میری منتظر تھی اور وہ خود آپ گھر کے اندر گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک رہی تھی۔ میرے ہاتھ سے مٹھائی کی ٹوکری تھپ سے فرش پر آ گری۔

میں اِس وقت پچھتر سال کا ہوں، حالاں کہ میرے نام بس اتنے ہی سال لکھے ہوئے تھے جتنے میں نے اپنی شادی سے پہلے ماں کے ساتھ بتائے۔ شادی کے بعد بھی جیتے چلے جانے کے لیے میں نے اپنی ماں کی ہی بقیہ عمر چرالی تھی، ورنہ سوچو، پینتالیس کی عمر بھلا مرنے کی ہوتی ہے؟

نہیں، ڈاکٹر، میری پوری کہانی اطمینان سے سن لو، تاکہ تمھیں یقین آجائے کہ میں نے اپنی یادداشت نہیں کھوئی...... میری بیوی؟...... ششو میری ماں کی موت پر اتنی خوش تھی کہ اُس سے اتنا بھی نہ ہو پایا تھا، منھ پکا کر کے مجھ سے ہمدردی جتا دے...... میرا سسر؟...... اُس نے گویا اپنا ہی موت کا خوف دور کرنے کے لیے کہا، مان چند، دراصل مر کے کوئی مر نہیں جاتا، بلکہ اُسی دم کسی کورے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ موت تو خدا کی رحمت ہے۔ سمجھ داری سے کام لو۔

میں نے بڑی سمجھ داری سے کام لیا۔ اُس نے غلط کیا کہا۔ ماں اگر خودکشی نہ کر لیتی تو اور دکھ جھیلتی۔ اُس نے جو کیا، وہ ٹھیک کیا، مگر اور زیادہ سمجھ داری سے کام لے کر میں اب اِس انتظار میں تھا کہ کب میرے سسر کی بھی مکتی ہوگی اور کب اُس کا سارا مال ہمارے ہاتھ لگے گا؟ اپنے باپ کی موت پر روتے ہوئے شاید ششو کی گھگی بندھ جاتی مگر سوچتی وہ بھی یہی ہوگی کہ پپا نے گھر کو اسپتال بنا رکھا ہے۔ اُس کے گنٹھیا کا اب یہی ایک علاج ہے کہ وہ اٹھ جائے۔

کیا، ڈاکٹر؟ اتنی لمبی کیس ہسٹری تم نے کبھی نہیں لکھی؟ مگر میں نے تو اپنا بیان ابھی شروع ہی کیا ہے...... کیا؟...... اختصار سے کام لوں؟ تم ٹھیک کہتے ہو، مگر یہ بھی کوئی معجزہ ہوگا کہ پورے پچھتر برس کا جھیلا ہوا پچھتر گھنٹوں میں بھی بیان کر پاؤں...... کیا؟...... باقی کل،

آج ہی کے وقت؟ جیسے تمہاری مرضی، ڈاکٹر۔

کیا ڈاکٹر، میں آج بہت تازہ دم لگ رہا ہوں؟...... نہیں، اب تک تو سورج اتنا چڑھ آیا ہے کہ اُس کی شعاعیں بدن میں چبھنا شروع ہو گئی ہیں۔ تازہ دم تو بس ذرا سے لمحے کے لیے اُس وقت محسوس کرتا ہوں جب رات بھر کی موت کے بعد صبح دم اچانک آنکھ کھول لیتا ہوں۔ رات کو جب آنکھ لگتی ہے تو موت کی اور منھ کیے ہوتا ہوں۔ شاید مرے مرے ہی کروٹ بدل چکا ہوتا ہوں اور آنکھ کھلنے پر میرا منھ از سر نو زندگی کی طرف مڑا ہوتا ہے...... نہیں ڈاکٹر، واقعی یوں ہی ہوتا ہے۔ تازگی کے وہی چند ایک پل میرے دن بھر کے جہنم کے انعام کے مانند ہوتے ہیں۔ اُس گھڑی مجھے کچھ برا سوجھتا ہے، نہ اچھا۔ جینے جاگنے کے باوجود کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ شاید اِسی کا نام جنت ہے...... کیا یہ صحیح نہیں، ڈاکٹر، کہ جہنم سے ہوئے بغیر جنت تک پہنچنا نہیں ہوپاتا؟...... میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟...... پتا نہیں، کیا؟...... شاید یہ، کہ میں اپنی زندگی میں جتنا بھی اچھا رہا، وہ صرف اور صرف اپنی برائیوں کی بہ دولت...... نہیں، اچھائی اور برائی کا سہولتی تعین مت کرو۔ ہم محض کتھائی ترجیحوں کے عادی ہو کر کچھ اچھا سمجھ لیتے ہیں، کچھ برا...... ہاں، ٹھیک ہے، اپنی بے سہارا اماں کو اکیلا چھوڑ کر میں نے بہت برا کیا، لیکن ایسا نہ کرتا تو میرے مستقبل کے تعلق سے اُسی کی خواہش پروان کیسے چڑھتی، جسے اُس کی لوریوں میں سن سن کر میں اونچا ہوتا چلا گیا۔ میں نے جو کیا، اس کے سوا اور کیا کرتا؟ اونچا ہو ہو کر جب میرا ہاتھ پیڑ تک آن پہنچا تو میں نے اُسی کی خواہش سے بے بس ہو کر بے اختیار پکا ہوا آم توڑ لیا۔

اپنی کہانی ہی تو سنا رہا ہوں۔ اپنی بیوی کے بارے میں بتاؤں؟...... پہلے پہل ششو کی نرم کلامی نے مجھے اُس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ باہری زندگی میں وہ ایسے منھ بند کر کے بولتی تھی جیسے اپنے آپ سے ہم کلام ہو۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے والی لڑکیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب تک کان کھڑے کر کے نہ سنو، وہ سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ اسی لیے تو میں ششو پر مرمٹا کہ وہ میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اُسے سمجھ پانے کی خاطر میں اُسے رابرٹ براؤننگ کی شاعری کی طرح اکثر اپنے ذہن میں کھولے رکھتا۔ مگر شادی کے فوراً بعد ہی مجھے پتا چل گیا کہ باہری میک اَپ اتارتے ہی وہ گھر میں پورا منھ کھول کر بات کرنے کی عادی

ہے۔ مجھے اور نوکروں کو چھوڑو، غصہ آنے پر وہ اپنے باپ پر بھی چیخنے سے باز نہ آتی۔

نہیں، مان چند...... بوڑھا پروفیسر برا ماننے کی بجائے اُس کے دفاع میں مجھے بتایا کرتا...... میری ششو جیسے منہ کی بڑی ہے ویسے ہی دل کی بھی...... ہاں، ڈاکٹر، اُس کا دل واقعی اتنا بڑا تھا کہ بہ یک وقت دسوں عاشق مزے سے بستر لگا کر وہیں پڑے رہیں۔ اُس کے باپ کو شاید اب یہی کھٹکا تھا کہ ششو کا کوئی نام نہاد عاشق اُس کی موت کے بعد ساری جائداد گول کر کے چلتا بنے گا...... نہیں، مجھ پر بوڑھا پروفیسر پورا بھروسا رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، اِسی لیے تو میں نے تمہارا انتخاب کیا کہ ایک تم ہی اُس کی حفاظت کی ذمہ داری کے اہل ہو...... کیا بتاؤں، وہ تو چلتا بنا اور میں ساری زندگی اپنی بیوی کی پہرہ داری کر کے لٹتا رہا...... وہ تو اپنے عاشقوں کے ساتھ موج میلے اڑاتی رہی، اور میں یہی دیکھتا رہ گیا کہ کوئی اُسے دھوکا نہ دے جائے۔

نہیں، ڈاکٹر، اپنے سسر کا اعتماد حاصل کر پانے میں میں نے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کیا۔ آخری دموں پر تو وہ مجھ پر اتنا وشواس کرنے لگا تھا کہ اُس نے اپنی ساری جائداد اِس خیال سے میرے نام لکھ دی کہ بیٹی مورکھ ہے، پر داماد پوری سوجھ بوجھ کا مالک ہے، وہ میری بیٹی کو سدا ہر آفت سے بچا کر رکھے گا...... میں اپنی پوری سوجھ سے کام لے کر ششو کی چوکیداری کرتا رہا۔ وہ اپنے کسی چاہنے والے سے کبھی بدگمان ہو جاتی تو بستر میں اسے گالیاں بکتے ہوئے مجھے نوچ نوچ کر پیار کرتی۔

ہاں، ڈاکٹر، بڑی عجیب بچولیش تھی۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو اِس میں تمہارا کیا دوش؟ مجھے بھی کہاں یقین آتا ہے؟...... نہیں، ڈاکٹر، میں اور کیا کرتا؟...... پرانے وقتوں میں شوہر اپنی بداخلاق بیویوں سے اس لیے جھگڑتے تھے، یا متعلقہ شخص کو شوٹ کر دیتے تھے کہ وہ بس ایک ہی ہوا کرتا تھا۔ لڑائی تو صرف ایک سامنے والے سے کی جا سکتی ہے، اُن سے تو نہیں جو نا معلوم کون اور کہاں ہیں...... نہیں، پراسٹی چیوٹ میری بیوی نہیں، مَیں تھا...... نہیں بھائی میرے، اُن وقتوں کو بھول جاؤ جب صرف عورتیں اپنے جسم بیچا کرتی تھیں۔ میں نے اپنی روح کو بھی دام پر لگا رکھا تھا۔ کوئی مرد ہو یا عورت، مارکیٹ اکانومی کا سیدھا سا اصول ہے کہ خریدتا وہی ہے جس کی جیب میں پیسہ ہو...... نہیں، بوڑھا پروفیسر اگرچہ اپنی ساری جائداد میرے ہی نام کر گیا تھا، تاہم اپنے وصیت نامے میں اُس نے یہ بھی شامل کر رکھا تھا کہ میں ششو کی روزمرہ کی ضروریات عین اُس کی خواہش کے مطابق پوری کرتا

رہوں۔

وہی تو میں چپ چاپ کرتا رہا...... کیا کہا، مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟...... ہنومت، ڈاکٹر، تم تو نفسیات کے ڈاکٹر ہو۔ ہر کوئی وہی کچھ کرتا ہے جو اُس سے ہو رہا ہوتا ہے۔ کچھ اور ہمیشہ کوئی اور کرتا ہے...... نہیں، شادی سے پہلے بھی ششو ویسے ہی تھی جیسے شادی کے بعد۔ اگر شادی کے بعد یکایک وہ نیکی اور وفا کی دیوی بن جاتی تو مجھے لگتا کہ پروفیسر نے دھوکا دہی سے کام لے کر مجھے اپنی بیٹی کی بجائے ملازمہ سے بیاہ دیا ہے۔ پروفیسر کو معلوم تھا کہ مجھے سب معلوم ہے، اور مجھے معلوم تھا کہ وہ جتنا تیز دوڑے گی اتنی ہی تیزی سے اُس کی سانس اکھڑے گی...... ہہ ہاہہ!...... تم مجھے ولن سمجھ رہے ہو ڈاکٹر، تو کیا غلط سمجھ رہے ہو۔ ولن تو میں ہوں ہی، مگر سچ بتاؤں تو قانونی چارہ جوئی نے ہی مجھے ولن بنایا...... ہاں یہی چارہ جوئی کہ میرے کچھ کیے دھرے بغیر ہی کانٹا نکل جائے، یعنی اپنے ہی کیے دھرے کی بنا پر وہ راستہ ناپے...... کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ نیک اور پارسا خواتین کی عمریں کتنا طول کھینچ جاتی ہیں؟...... ہاں...... ہہ ہاہہ...... اتنا طول کہ بڑے آرام سے یکے بعد دیگرے چار پانچ مردوں کی چھٹی ہو جائے...... میری ماں؟...... ماں پارسا کہاں تھی؟ پارسائی تو ایک شعوری عمل ہے۔ وہ بے چاری تو نہایت معصوم، نہایت ناسمجھ تھی اور جو بھی کرتی تھی، حسی اور وارداتی طور پر۔

اور سیدھے سیدھے کیسے بتاؤں، ڈاکٹر؟ سیدھے سیدھے یہی ہے کہ میرا گھر چکلا بنا ہوا تھا۔ ہماری ہر سرکار کا دعویٰ رہا ہے کہ چکلے اٹھائے جا رہے ہیں۔ انھیں کیا پتا، چکلے بازاروں سے اٹھ کر گھر گھر آباد ہو رہے ہیں...... میری بیوی کی موت کا قصہ؟...... اُسی طرف تو آ رہا ہوں۔ اتنا ہنگامہ خیز ہے مانو کوئی فلمی کہانی ہو، مگر ششو جی بھی تو اِسی طرح رہی تھی...... میری بیوی کے مداحوں میں اردو کا ایک شاعر بھی تھا۔ جس کی وہ بہت آؤ بھگت کرتی تھی۔ اُس دن اچانک یہ شاعر مہاشے اپنی بیاض سے لیس ہو کر آ دھمکا۔ ششو نے شراب و شعر کی شام کی توقع میں اُسے رات بھر کے لیے وہیں ٹھہرا لیا، مگر جو ہوا وہ یہ کہ اُسی رات ششما دیوی کا ایک عاشق بلدیو سنگھ نشے میں جھومتا ہوا ٹپک پڑا۔ ہمارا نوکر اُسے بہانے بہانے سے روکتا رہا مگر وہ اُسے پرے دھکیل کر ششو کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور دروازہ ٹھک سے کھول کر جو منظر دیکھا اُسے دیکھتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور شاعر پر جھپٹ پڑا...... ہاں، غصہ تو مجھے آنا چاہیے تھا، پر بتا تو چکا ہوں، جسے آ جاتا ہے صرف اُسے ہی آتا ہے۔ ششما دیوی ایسے

قضیوں کو عموماً بڑی ہوشیاری سے نمٹا دیتی تھی، مگر اُس وقت وہ بھی شاید زیادہ ہی پیے ہوئے تھی، ہوش کھو بیٹھی اور لپک کر پستول نکال لیا اور شاعر مہاشے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ بلدیو سنگھ تو نشے میں دھت تھا ہی، اُسے کچھ اور نہ سوجھا تو ششما سے پستول چھین کر اپنی دانست میں شاعر پر گولی داغ دی۔ گولی ششما کے سینے میں جا دھنسی۔

نہیں، ڈاکٹر، پیشہ ور مجرم تو بڑے سادہ لوگ ہوتے ہیں، بڑی معصومیت سے اپنا فرض سمجھ کر جرم پہ جرم کیے جاتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں تو پھانسی چڑھتے ہوئے، خوف زدہ بچوں کی طرح نظر آتے ہیں اور قانون کی بے حسی پر غصہ آنے لگتا ہے۔ اصل مجرم تو ہم معززین ہیں۔ کیا مجال، ہم سے خلافِ قانون کچھ سرزد ہو جائے۔ ہم صرف نیتاً اپنے جرائم انجام دیتے ہیں اور اُن کا اصل ارتکاب ہمارے لیے دوسرے کر لیتے ہیں...... ولینی؟...... یہی تو میرا کہنا ہے کہ جو معززِ کھتے ہیں وہ دراصل ولن ہوتے ہیں۔

کسی اور مریض کی اپوائنٹمنٹ کا ٹائم ہو گیا ہے؟...... او، کے، ڈاک، میں کل پھر اسی وقت آ جاؤں گا۔

آج سویرے میں نیند سے جاگا ڈاکٹر، تو جانتے ہو، کیا؟...... میں رو رہا تھا!...... کیوں؟...... نہ جانے کیوں...... نہیں، مجھے ٹوکو نہیں...... بس بے ذہن روئے جا رہا تھا اور رو رو کر مجھے بڑی راحت محسوس ہو رہی تھی...... کیا؟ اس سے پہلے کب رویا تھا؟...... نامعلوم کب...... جہاں تک یاد آتا ہے، میں کبھی رویا ہی نہیں، بس سوچ سوچ کر ہی بوڑھا ہوتا چلا گیا...... نہیں، ڈاکٹر، جو کبھی رویا ہی نہ تھا، اُسے کیا معلوم، کیسے رویا جاتا ہے، مگر پھر بھی بجنسہٖ روئے جا رہا تھا اور رو رو کر لگ رہا تھا کہ کھلکھلا کر ہنس رہا ہوں...... نہیں، ڈاکٹر، میں پاگل نہیں ہوں...... ہاں، آج صبح میں بھی اپنے آپ کو یہی بتا رہا تھا کہ میں نے اپنی ساری زندگی ناحق پاگل پن میں ہی گنوا دی۔ میری طرح سوچ سوچ کر آدمی سوچنے کے قابل کہاں رہتا ہے؟...... اُس کی ماں گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک جاتی ہے۔ بیوی کے قتل پر وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اُس کی ایک جائز اولاد ہوتی ہے اور ایک ناجائز۔ جائز اولاد ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہوتی ہے اور ناجائز، تن درست اور جان درست۔

میں جب رو رہا تھا ڈاکٹر، تو میرا اپاہج اور مخبط بیٹا سندر اپنا جسم فرش پر گھسیٹ کر

میرے کمرے میں چلا آیا اور میرے سرہانے پہنچ کر میرے ہاتھ کو اپنے گال سے چپکا لیا اور سسکیاں بھرنے لگا۔

سندر کے پیچھے پیچھے راگھو بھی آوارد ہوا اور ہم دونوں کو روتے پا کر ہکا بکا رہ گیا۔ "کیا بات ہے، پاپا جی؟"

شاید پہلی بار رو رو کر شفاف اور سبک ہو جانے کا جادو تھا جو میں اُس کی آواز میں ترحم اور ممتا محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا...... راگھو دراصل بڑا نیک لڑکا ہے ڈاکٹر۔ حرامی تو میں ہوں جو ہمیشہ شک و شبہ کو ہی خیر و حسن کا متبادل سمجھا کیا۔ پاگل کو پاگل سمجھ کر ہی تو پاگل کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ راگھو میرے سکون کی تدبیر ہی تو کرنا چاہتا ہے مگر برکتوں کی راہ سے عمر بھر کے بھٹکے ہوئے کی نجات کیسے ہو؟...... یا پھر ہو تو راگھو جیسے بیٹے کی بہ دولت، جس نے میرا برا بھلا جھیل کر کبھی ماتھے پر بل نہ پڑنے دیا۔

راگھو میری پائینتی بیٹھ کر میرے پاؤں دبانے لگا۔ "بتائیے پاپا جی، کیا شکایت ہے؟"

میں اُسے کیا شکایت بتاتا؟...... کہ تم حرام کی اولاد ہو، کہ مجھے شک ہے تم میری دولت پر قبضہ جمانے کے لیے مجھے پاگل ٹھہرانا چاہتے ہو، کہ ...... کہ ...... نہیں، ڈاکٹر، نہیں حرامی تو میں ہوں جسے اِس گھور بڑھاپے میں بھی ایمان کی دولت نصیب نہیں اور جو شبہات کی اِتنی تنگ قبر میں دراز ہے کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا...... مگر آج صبح میں نے واقعی کروٹ بدل لی ڈاکٹر، اور کروٹ بدل کر راگھو کو جو دیکھا تو وہ کوئی اور ہی لگا۔ وہی لیکن اپنا ہی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہی ان دیکھے ذرات میری ناجائز اولاد کے خون میں دوڑ رہے ہیں۔ میں واقعی پاگل ہوں۔ وہ تو مجھے میرے روگ سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہے اور میں...... وہ میرے بستر پر آگے کھسک کر میری چھاتی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

راگھو کے پیچھے اُس کی بیوی بھی کمرے میں آ گئی...... "کیا بات ہے، پاپا جی؟......" اور اُس کے پیچھے اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے دوڑتے ہوئے میری ننھی منی پوتی بھی...... "لو کیوں لیٹے ہو، پاپا جی؟"

میری پوتی بھی اچھل کر میرے بستر پر آ بیٹھی اور میری قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پوچھنے لگی، "تمالی جیب تو کھالی ہے، پاپا جی؟"

میں اُسے کیا بتاتا، میری جیب بھری کب تھی؟

میں واقعی پاگل ہوں، ڈاکٹر، اور اگر نہیں ہوں تو مجھے کوئی انجکشن دے کر پاگل کر دو، تاکہ میں اپنی ساری عمر کی یادداشت کھودوں۔ جانور کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ بھولے بھولے ہی دم ہلا ہلا کر جیے جاتے ہیں۔

اپنے پچھتّر سالہ عقب میں میں موت ہی موت جیتا رہا ہوں اپنی سوچوں اور شبہوں میں دولت...... اور دولت ...... اور دولت جوڑتا رہا ہوں اور اپنا باقی سب کچھ گنوا بیٹھا ہوں اور ...... اور ڈاکٹر، بڑا غریب اور بے کفیل ہو گیا ہوں۔

پلیز ڈاکٹر، مجھے کوئی تگڑا انجکشن دو اور سدا کے لیے سلادو، تاکہ آگے مجھے اپنا عقب پیش نہ آئے اور موت کے بعد آنکھ کھولوں تو کسی کوری اور بابرکت ساعت کے پروں پر بے وجود جا بیٹھوں...... پلیز، ڈاکٹر، ......!

ڈیرا بابا نانک

کوئی واردات بدن کا گھیرا توڑ کر روح کو جالیتی ہے تو عمر بھر جوں کی توں لیے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس پوری نصف صدی میں یہ خواب بار بار میری نیند میں رینگ آیا:

سب سے آگے گائیں ہی گائیں چلی آ رہی ہیں اور اُن کے پیچھے گندے گندے گول مٹول اجول بچے، اور بچوں کے پیچھے برف براق پر ندہ ڈاڑھیوں والے بوڑھے اور ...... سب سے آخر میں ......

مگر میں وہ پوری واردات ہی کیوں نہ بیان کر دوں؟

تقسیم ملک کے موقع پر شہر اور گاؤں میں فسادات بپا تھے، کچھ اِس طرح، کہ جو جان بچانے کے لیے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے اُنہی کو جوانمرد سمجھا جاتا۔ جمگھٹ کے جمگھٹ وہاں سے یہاں آ رہے تھے اور یہاں سے وہاں جا رہے تھے۔

آخر ہم بھی سیالکوٹ سے ڈیرہ بابا نانک آن پہنچے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تھے تو ہمیں یکسر علم نہ تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے ...... سرحد پار؟ ...... کونسی سرحد؟ مرے مکوں کو کیا معلوم، انہیں کون سی سرحد پار کر کے کہاں پہنچنا ہے؟ مگر جہاں کہیں ہماری گاڑی رک جاتی ہم سبھی مر دے اِس خوف سے سانس بھرنے لگتے کہ ہم دوسرے جہاں کے کنارے آ لگے ہیں، ابھی وہ آناً فاناً نعرے بلند کرتے ہوئے ہمارے ڈبے میں آ گھسیں گے اور روحوں سمیت ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

مگر ہم سرحد پار آن پہنچے ...... یہاں، ڈیرہ بابا نانک، جہاں ہم نے کیا دیکھا کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہم چہار سمت کٹے پڑے ہیں ...... یہاں ہاتھ، وہاں پیر، وہاں جگر کالو تھڑا ...... وہ کسی عورت کا گچھا پستان اور یہ سکڑا ہوا عضو تناسل ...... اتنا سکڑا ہوا، کہ کسے پتہ، ہندو کا ہے یا مسلمان کا؟

مگر ہمارے ہی ساتھ ایک نراپراپاگل بھی آ گیا تھا۔ ایک بے نام پاگل، جس کے بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ نہ جانے، پاکستان میں کہاں سے بھاگ کر ہمارے رفیوجی کیمپ میں چلا آیا تھا۔ پگلا کبھی تو چلانے لگتا...... نہیں، مجھے مت مارو۔ میں ہندو ہوں...... یہ دیکھو!...... وہ اپنی قمیص اٹھا کر پاجامے کا ناڑا کھولنے لگتا...... یہ دیکھو! اور کبھی ...... نہیں، مجھے مت مارو۔ میں مسلمان ہوں...... یہ دیکھو!...... پگلے کی نظر اچانک زمین پر ایک کٹے ہوئے عضو تناسل پر جا پڑی۔ وہ گھبرا کر اپنا ہاتھ پاجامے کی طرف لے گیا اور شاید وہاں کچھ نہ پا کر دوڑ کر بے اختیار عضو تناسل کو اٹھا لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے ٹٹولنے لگا کہ کسی اور کا ہے یا اُسی کا۔

رونے کے ہزار اسباب ہوں تو کوئی لاشعوری طور پر یہی چاہتا ہے کہ ذرا ہنس لے۔ ہم کئی لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

نہیں، میرا ہی ہے!...... پگلا اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا......

"تمہارا کیسے، باؤلے؟ اِدھر تو صرف مسلمانوں کو کاٹا گیا۔"

"اچھا؟" پاگل نے ایک دفعہ پھر عضو تناسل کو ٹٹولا۔ "اچھا!۔" اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ پھر وہ بھی کوئی مسلمان ہی ہو گا۔ اس نے نا معلوم کیا سوچ کر اپنا گلہ دبوچ لیا اور اسے اتنے زور سے دبایا کہ اس کی آنکھیں باہر ابھر آئیں۔ مُسلے!۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا مسلے! میری آنکھوں کے سامنے تم نے میرے بوڑھے ماں باپ کو قتل کیا اور میری بہن سے زنا کیا اور۔ اور............ آگے بڑھ کر اسے کوئی اسی سے چھڑا نہ لیتا تو وہ اپنا دم لے کر ہی دم لیتا۔

اتنے میں ہجوم میں افواہ گرام ہونے لگی کہ تھوڑی ہی دیر میں مسلمان پناہ گزینوں کا ایک پیدل قافلہ سرحد پار کرنے کے لئے یہاں سے گزر رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا سبھی لوٹ مار کے لئے برچھے بھالے سنبھالنے خیموں کی طرف دوڑ کھڑے ہوئے تا کہ سب سے پہلے موقع اور مطلب کی جگہ پر قبضہ جمالیں۔

مجھے اپنی پشت سے ایک تلک دھاری آواز سنائی دی۔ "ہماری کوم پر گتی کیا کھاک دھول کرے گی۔ یہ شبھ اَوسَر مُسلوں ملیچھوں کو کھتم کرنے کا ہے یا دھن دولت لوٹنے کا؟......"

"اوئے پنڈتا، یہ نیک کام کرنے کو ہم جو ہیں۔ آؤ دوستو!"

مگر اسی اثناء میں رفیوجی کیمپ کے دفتر سے لاؤڈ اسپیکر پر آواز سنائی دی: بھائیو، دھیان سے سنو! اِدھر سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ اُدھر جا رہا ہے، اور اُدھر سے ہندوؤں اور سکھوں کا ایک بہت بڑا قافلہ اِدھر آرہا ہے...... اگر ہم نے اِدھر کوئی گڑبڑ کی تو اُدھر وہ لوگ ہمارے سینکڑوں ہزاروں بھائیوں کا خون بہانے سے باز نہیں آئیں گے...... ساودھان، بھائیو! بھول کر بھی حملہ مت کرو صرف دور سے دیکھو اور جانے دو...... ساودھان!

لوگ مایوس ہو کر سرحد سے جڑی ہوئی شاہراہ کی طرف بکھرنے لگے جہاں سے مسلمان پناہ گزینوں کو گزرنا تھا۔

بھائیو، دھیان سے سنو! ادھر سے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ......

میں نے آواز سے کان ہٹا کر اس پاگل کی طرف دیکھا جسے ابھی تک سمجھ میں نہ آپا رہا تھا کہ اس کا عضو تناسل بالائی رانوں کے درمیان لٹکے لٹکے ایک دم کہاں غائب ہو گیا، مل جاتا تو وہ فوراً اپنی تسلی کر لیتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔

میں وہیں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ کر اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

پاگل کا ذہن خالی ہو کر بھائیں بھائیں نہیں کر رہا ہوتا۔ ناگہاں سوچوں کی یلغار ہی تو بے چارے کو پاگل بنائے ہوتی ہے۔ وہ بھی یکبارگی اپنی کسی پیش قدم سوچ کی ترغیب نہ لا پایا اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے انسانی اعضاء کو اٹھا اٹھا کر کوئی پوری شکل تیار کرنے میں جٹ گیا۔ تادیر وہ اپنی اس کوشش میں جٹا رہا اور میں اسے منہمک دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ وہ بڑے جتن سے کوئی شکل بناتا اور اس پر آنکھیں جما کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اعضا کی ترتیب کو بگاڑ دیتا اور از سرِ نو کوئی اور شکل بنانا شروع کر دیتا۔ اس نے کئی شکلیں بنائیں اور ہر بار مایوس ہو کر اعضا کو منتشر کر دیا۔ مجھے لگا کہ اس کے ذہن میں کوئی شکل پھنسی ہوئی ہے اور اسے بڑی اذیت میں مبتلا کیے ہوئے ہے اور وہ اسے ذہن سے باہر نکال کر اپنی نجات کی تدبیر کر رہا ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اچھل پڑا اور خوف سے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی بنائی ہوئی نئی شکل کو گھورنے لگا۔ مڑے تڑے انسانی اعضاء سے ترتیب دی ہوئی وہ ایک نہایت بدوضع عفریت صفت حیوان کی شکل تھی جو جھپٹ کر پاگل کے جسم میں دانت گاڑ لینا چاہ رہی تھی۔

خوفزدہ پاگل نے چیخ ماری اور جو بھاگنا شروع کیا تو ایک سیدھ میں شاہراہ کے ایک دور افتادہ موڑ کی طرف بھاگتا ہی چلا گیا جہاں سرحد کی طرف بڑھتے ہوئے مسلم مہاجروں کے

قافلے کی گرد اڑ رہی تھی۔

میں اس خیال سے بہت خوش تھا کہ آخر کار پاگل عفریت کو ذہن سے خارج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ ابھی تک سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔ جب اپنے آگے درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا تو میں منہ موڑ کر شاہراہ کے ایک قریبی کنارے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

سڑک کی دو جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک فوجی تعینات تھا، تاکہ مسلم مہاجر بہ حفاظت سرحد پار کر جائیں۔ ہر فوجی کے پیچھے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ذرا اور آگے آ کر خوش قسمتی سے مجھے ایک خالی کنارہ مل گیا۔ میں وہاں رک کر سگریٹ سلگانے لگا تو فوجی گارڈ نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہونے کی ہدایت کی۔

میں نے فوراً پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے تنے پر پیٹھ لگا لی اور قافلے کا انتظار کرتے ہوئے اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ فسادیوں نے ہمارے گھر پر بھی ہلہ بول دیا تھا۔ وہ تلواریں کھینچے میری طرف لپکے تھے کہ بیچ میں ماں آ گئی اور تلوار کے وار سے تڑپ تڑپ وہیں دم توڑ دیا۔ فسادیوں نے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون مرا ہے، میں یا میری ماں۔

میں گھر کے آنگن میں ہی ماں کی ارتھی جلانے کے لئے چولہے کی لکڑیاں جمار ہا تھا کہ دو سکھ فوجی دھپ دھپ گھر میں گھس آئے۔ نکلو! چلو!...... لیکن میری ماں؟...... جو مر گیا، اسے چھوڑ دو اور خود کو بچاؤ۔ چلو!......

سڑک پر پہرہ دیتے ہوئے فوجی نے میری طرف پھر شک بھری نظروں سے دیکھا اور اب کے میں خود آپ ہی درخت سے ٹیک ہٹا کر دو قدم پیچھے آ کھڑا ہوا، اور اسی دوران قافلے کا اگلا حصہ ہمارے قریب آ پہنچا۔

آگے آگے گوری اور بھوری صحت مند گائیں تھیں کہ وہ جانتے تھے کہ ہندو گائیوں پر کبھی حملہ نہیں کریں گے...... گائیوں کے پیچھے گول مٹول گندے گندے بچے تھے جو نڈھال ہونے کے باوجود بڑے اجول لگ رہے تھے...... اُنہیں معلوم تھا، ہندو بچوں کو بھگوان کا روپ مانتے ہیں...... سہمے ہوئے بھگوان اپنے تھکے ماندے پھولے ہوئے ننگے پیروں سے بے اذیت چل رہے تھے...... بچوں کے پیچھے نحیف بوڑھے، جن کی کانپتی ہوئی

سفید ڈاڑھیوں میں پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ کا احساس ہوتا تھا...... اور ہر بوڑھے کو کوئی جوان سہارا دے رہا تھا کہ بوڑھوں پر ترس کھا کر جوانوں پر بھی کوئی ہاتھ نہیں اٹھائے گا...... اور ان کے پیچھے ہائے ہو کرتی ہوئی بوڑھیاں اور چلتے پھرتے بھی بوڑھیوں کی خدمت کرتی ہوئی ان کی جوان بہو بیٹیاں...... ان خدمت گزار بہوؤں اور ان کی کوری کنواری نندوں کو کیسے کوئی میلی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے؟...... اور ان کے پیچھے ادھیڑ عمر ملے جلے مرد و زن، بلبلاتے شیر خواروں کو بازوؤں اور کندھوں پر لئے ہوئے۔ سبھوں کے گلوں میں اللہ اکبر کا نعرہ اٹکا ہوا تھا جو سرحد پار کرتے ہی وہ پورا منہ کھول کر اتنے زور سے بلند کریں گے کہ واقعی کوئی معجزہ رونما ہو جانے کا گمان ہونے لگے گا...... اور......

اور...... ارے!...... سب کے پیچھے کسی زار و نزار ماں کے پہلو میں اس کا بچہ اپنے کندھے پر دونوں بازوؤں میں نہایت ہوشمندی سے سمیٹے ہوئے...... وہ!...... وہی ہمارا پاگل!......

دیکھئے بھائی،...... میں نے بھونچکا ہو کر فوجی کو بتانا چاہا کہ وہ پگلا تو ہمارے ساتھ ادھر سے ہی آیا تھا۔

شی۔ ی۔! فوجی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارے سے مجھے اور پیچھے ہٹ جانے کی ہدایت کی۔

میری آنکھیں پگلے سے ہٹائے نہ ہٹ رہی تھیں...... مسلمان ہے؟...... نہیں، ہندو ہی تو ہے۔...... تو...... تو......

دیکھئے بھائی......

شی۔ ی!......!

مارکیٹ اِکانومی

یو، ایس، اے، کا دیو قامت ہوائی جہاز دلّی ائر پورٹ پر اترتے ہوئے کوئی بھیانک میزائل معلوم ہو رہا تھا جو زمین کو چھوتے ہی پھٹ جائے گا اور پھٹتے ہی ساری دلّی کو زیروزبر کر کے رکھ دے گا، مگر ہوائی جہاز کے ہزار پایہ کمپیوٹر نے اسے اتنے غیر محسوس طور پر زمین پر لا اتارا کہ مسافر لینڈنگ کے بعد بھی اپنے گدوں پر بیٹھے بیٹھے بدستور ہوا میں اڑے جا رہے تھے۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، دا ٹمپریچر آؤٹ سائیڈ از ٹو نٹی فائیو سیل سی اس۔"

"جسٹ دا ٹمپریچر فار سٹے بل گلوبل مارکیٹ۔" ولیم ہٹ مین اپنے پہلو میں بیٹھی تربیت یافتہ نیگرو سیکریٹری بلیک برڈ کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "میں نے سنا ہے برڈی، کہ ہندوستان میں موسم اچھا ہو تو کوئی نہ کوئی وبا پھوٹی ہوتی ہے۔"

"میں چیک کر چکی ہوں۔" بلیک برڈ نے فخریہ جواب دیا۔ "دہلی ٹھیک ٹھاک ہے۔ البتہ دہلی سے کوئی ساٹھ کلو میٹر دور ایک شہر میرٹھ میں کنجیک ٹیوائٹس کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔"

"کنجیک ٹیوائٹس۔ یعنی؟......"

"آنکھوں کی بیماری ہے جس سے......"

"نو مائی ڈئر، ایکسپلین مت کرو۔ ہمیں کیا یہاں کنجیک ٹوائٹس کی کوئی دوا ٹریڈ کرنا ہے؟" وہ اپنی سیٹ سے اٹھنے کی تیاری کرنے لگا۔ "آؤ، اب باہر نکلیں۔"

وہ دونوں اٹھ کر جہاز کے دروازے پر پہنچے تو ایک ہوسٹس نے جلدی میں ان کا پیچھا کر کے ہٹ مین کو اطلاع دی کہ میڈم اور لالہ سادھو رام نے ٹیلیفون پر...... ٹو کوٹ دیم...... ڈھیروں گڈ وِشیز بھیجی ہیں......

"تھینک یو!" ہٹ مین اسے ٹوک کر اپنی پرسنل سکریٹری کو مسکرا کر بتانے لگا۔ "ہمیشہ یاد رکھو برڈی، نیک خواہشات اور تحائف کی مارکیٹنگ ہمیشہ بڑے التزام سے سجا کر کی جاتی ہے، ڈھیر بنا کر نہیں۔"

جواباً اس کی سکریٹری کے علاوہ ہوسٹس بھی مسکرانے لگی اور اسے اپنی سکریٹری کی طرف متوجہ پا کر اُسی کی طرف منہ کئے لالہ سادھو رام کے پیغام کو جلدی جلدی پورا کر دیا۔

"اور کہا ہے کہ وہ دونوں لونج میں آپ کے منتظر ہیں۔"

"تھینک یو!" ہٹ مین نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور اپنی سکریٹری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جہاز کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ "مگر تم نے تو مجھے بتایا تھا برڈی، کہ لالہ سادھو رام اور اس کی بیوی ایک دوسرے سے طلاق لے چکے ہیں۔"

بلیک برڈ نے سیڑھیوں پر ہی رک کر اپنے باس کو جواب دینا چاہا مگر اپنے پیچھے آتے ہوئے مسافروں کو دیکھ کر وہ ویسے ہی چلتی رہی اور اپنی کمر پر اس کی متحرک انگلیوں کا لمس محسوس کر کے یہ سوچ کر مسکرا دی کہ اس کا باس شاید بے دھیانی میں کورے چیک کی چکنی سطح پر کوئی ہندسہ لکھ رہا ہے۔

وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے تو وہ ہٹ مین کو بتانے لگی۔ "تم نے مجھے غلط سمجھا، وکی۔"

"مگر میں نے کیا غلط سمجھا؟"

"یہی، کہ ہمارے لالہ اور اس کی بیوی نے ایک دوسرے کو چھوڑ رکھا ہے۔ وہ تو انہوں نے اپنے انکم ٹیکس صلاح کار کی رائے پر یونہی سی سرکاری طلاق لے رکھی ہے۔"

ولیم ہٹ مین ہنسنے لگا۔

"یہ یونہی سی سرکاری طلاق کیا ہوتی ہے مائی ڈیئر برڈی؟"

بلیک برڈ نے بڑی سنجیدہ ہو کر اسے سمجھانا چاہا مگر اس نے اسے ٹوک دیا۔ "نہیں، سمجھاؤ نہیں، مائی انوسینٹ برڈ۔ میں سب جانتا ہوں۔" اس کا متحرک ہاتھ اپنی سکریٹری کی کمر پر ایک بڑا موٹا ہندسہ لکھنے کے لئے کمر کے آخری سرے تک صفروں میں اضافہ کئے جا رہا تھا۔ "اگر میرا انکم ٹیکس وکیل مجھے مشورہ دے تو میں بھی جھٹ اپنی اولڈ گرل کو طلاق دے دوں اور۔ جانتی ہو، کیا؟......" اس نے بلیک برڈ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر اپنی ایک آنکھ

میچ لی۔ ”اور......“

”ہاں، ہاں، اور؟......“

”اور تم سے شادی کر لوں۔“

بلیک برڈ اپنی مسرت کے ڈرامائی اظہار کے لئے اس کے بازو سے باہر اچھل آئی۔ ”سچ؟ پھر تو ولی، میں تم سے شادی کرنے کے لئے آج سے ہی تمہارے وکیل سے عشق کرنا شروع کر دوں گی۔“

”ہاؤ بیوٹی فلی مس چیوس!“ ہٹ مین اسے پر توصیف نظر سے دیکھتے ہوئے کالے حسن کے طلسم سے مسحور سا دکھائی دینے لگا۔

جب وہ ائر پورٹ کے لونج میں پہنچے تو ایک مختصر سے گروپ کے آگے ہٹ مین اینڈ لالہ فنانس (انڈیا) کا کو چیئر مین لالہ سادھو رام اور اُس کی بیوی اپنی کمپنی کے چیئر مین کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھے۔ لالہ سادھو رام اپنے مغربی سوٹ کے باوجود سر پر پگڑی باندھے ہٹ مین کو مشرقی کہانیوں کا کوئی تماشہ گر سا معلوم ہوا۔ ہٹ مین کا امریکی نمائندہ خاص برائے انڈیا جیکل نارمن بھی ان دونوں کے پہلو میں نشان فجائیہ سا بنے سیدھا کھڑا تھا اور انہیں دیکھتے ہی ان کی جانب دوڑ آیا تھا۔

”ہیلو! ڈئر اولڈ راسکل۔“ ہٹ مین نے اس کے کندھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”ایوری تھنگ آل رائیٹ؟“

”نیور سو گڈ اِن ڈیڈ!“

اس سے الگ ہو کر ہٹ مین لالاؤں کی طرف بڑھا۔

لالہ سادھو رام ابھی اسے پہچان بھر دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ رنگ دار ریشمی ساڑی میں لپٹے اور ماتھے کو سرخ ٹیکے سے خونریز کئے اس کی بیوی لپک کر ہٹ مین کی طرف آئی اور اتنی سرعت سے موٹے موٹے گٹوں کا ایک نہایت لمبا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا کہ اسے لگا وہ خود آپ ہی اس کے گلے میں جھول گئی ہے۔

”آئی ایم مسز لالہ۔ اوشا سادھو رام۔“ اس نے ہٹ مین کے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”ویل کم ٹو انڈیا!“

”تھینک یو، مسز لالہ۔“

"ہاؤڈویوڈو، مسٹر ہٹ مین؟" لالہ سادھورام نے بھی موقع پاکر ہاتھ بڑھادیا۔ "امید ہے آپ کا سفر مزے سے کٹا ہوگا؟"

"ہاں، بہت مزے سے۔" لالہ سادھورام سے بڑے کاروباری تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے لالہ کو بلیک برڈ کی طرف دیکھتے پایا جس سے اس وقت جیکل بغلگیر ہو رہا تھا۔

"یہ میری پرسنل سکریٹری مس بلیک برڈ ہے۔"

بلیک برڈ فوراً جیکل سے علیٰحدہ ہو کر مسکرانے لگی۔

"برڈی۔ مسٹر اور مسز لالہ۔"

ہٹ مین پھر جیکل کی طرف مڑ گیا۔ "اینڈ ہاؤ آر یو جیکل بوائے؟" اس نے جیکل کا ہاتھ پکڑ کر لونج سے باہری دروازے کا رخ کرنا چاہا کہ سادھورام نے اس کے سامنے پانچ چھ آدمیوں کی قطار کھڑی کر دی۔

"یہ ہمارے ڈائرکٹر ہیں، مسٹر ہٹ مین۔"

"او، شیور!"

وہ ان سے باری باری ملنے لگا۔

"ہاؤڈویوڈو؟"

"اینڈ، مسٹر ٹوپی والا۔"

"ہاؤڈویوڈو، مسٹر ٹوپی والا؟"

"اینڈ......

پہلے دو ایک اشخاص سے مل کر ہی وہ بور ہونے لگا اور جی ہی جی میں ہنسنے لگا کہ وہ ان دور دراز کے اجنبیوں سے ان کا حال چال کیوں پوچھے جا رہا ہے...... مجھے کیا غرض؟...... ہاؤڈویوڈو؟...... غرض تو ہے۔ ہماری یکساں بیوپاری دلچسپیاں ہیں۔ اس سے بڑھ کے اور کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟...... ہاؤڈویوڈو؟...... ٹوہوں کے بغیر کامیاب مارکیٹنگ کیسے انجام پائے؟ خبر تو رکھنا ہی پڑتی ہے...... جذبۂ خیر؟ نان سنس! یا چلو، جذبہ خیر بھی سہی، مگر کھڑے کانوں، کھلی آنکھوں!...... ہاؤ...... ؟۔ ایک عورت سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے تعجب ہونے لگا کہ مسز لالہ دوبارہ ملنے کے لئے کیوں آ کھڑی ہوئی تو وہ اوہ! کہہ کر اس سے پوچھنے لگا۔ "کیا یہ خاتون آپ کی بہن ہیں؟"

"سبھی اسے میری بہن سمجھتے ہیں۔" مسز لالہ پھول کر کپا ہونے لگی تو واقعی گول مول سی لڑکی نظر آنے لگی۔ "یہ میری بیٹی کمو ہے۔"

"ڈونٹ ٹیل می، اوشا جی!" بلیک برڈ نے اسے راستے میں انڈیا ایکسپرٹ کی ہدایت کے مطابق، جی کہنے کی ریہرسل کروادی تھی، لہٰذا اس نے بلیک برڈ کی طرف دیکھ کر اپنی مارکیٹنگ کی داد چاہی...... سو اصل شئے وہ شئے بھی نہیں ہے۔ وہ خود کو بھی ویسے ہی حتمی انداز میں سمجھانے کا عادی تھا جیسے اپنے ماتحتوں کو...... جس کی ہم مارکیٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اصل شئے مارکیٹنگ ہے، یعنی خواہ کچھ بھی نہ بیچو، مگر پورے دام وصول کرلو...... "ڈونٹ یو تھنک سو؟" اس نے سوچتے سوچتے بہ آواز بلند جیکل سے پوچھ لیا۔ جیکل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر اپنے باس کی عادت سے بخوبی واقف ہونے کے باعث اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا، مگر ہٹ مین اتنی دیر میں ایک اور ملنے والے سے ہاتھ ملا رہا تھا......

"ہاؤ ڈو یو ڈو؟"...... بہت سمارٹ آرمی معلوم ہوتا ہے...... "کیا نام...... مسٹر ڈی سوزا...... ہماری کمپنی کا چیف آف پبلک ریلیشننگ...... ویری گڈ!"...... اے پرفیکٹ فگر!

"ہم سب کام کرتے ہیں" لالہ نے کہا۔ "مگر مسٹر ڈی سوزا، صرف باتیں۔"

"نہیں مسٹر لالہ، کام کی باتیں کام سے بھی مہنگی ہوتی ہیں۔" آئی ہوپ دی اولڈ بروٹ پیزہم ویل۔ "جب ہم پھر ملیں گے مسٹر ڈی سوزا، تمہیں میں ان دنوں کی باتیں سناؤں گا جب میں بھی ایک جگہ پبلک ریلیشنگ کیا کرتا تھا۔ تم تو ہمارے چیف ہو۔ میں ایک معمولی پی. آر. او. تھا۔"

(۲)

پنڈت نہرو واقعتاً ہندوستان کا پہلا پرائم منسٹر تھا اور من موہن سنگھ حقیقتاً پہلا فنانس منسٹر۔ انگریزی راج کے بعد پنڈت جی نے ٹین ڈاؤننگ سٹریٹ سٹائل میں پہلی بار ہماری سیاسی آزادگی کا آئینی اقدام کیا تو نتیجتاً پوری نصف صدی کے اقتصادی حبس میں لوگ باگ روٹی کی بجائے روٹی کے نعرے کھا کھا کر پلتے رہے اور پھر وائیٹ ہاؤس کی گلوبل مارکیٹ اکانومی کا درس حفظ کر کے ہمارے سردار جی جب سرمایہ کاری کے کھنڈرات کو قابلِ رہائش بنانے کے درپے ہوگئے تو ہمارا جسم ہی چچا سیم کا سیاسی زندان بن گیا جسے بڑی آزادی سے جہاں چاہو لئے پھرو۔ ہندوستان میں ٹریڈ لبرلائزیشن کے آغاز میں ہی ہٹ مین نے اپنی

بزنس ایمپائر کو بین الاقوامی وسعت میں پھیلانے کی ٹھان لی اور اپنے نمائندہ خاص جیکل نارمن کو تمام تر اختیارات عطا کر کے یہاں بھیج دیا اور اس کی سفارش پر بلا تامل ہٹ مین اینڈ لالہ فنانس (انڈیا) کی باقاعدہ تشکیل کی اجازت دے دی۔ پھر کوئی سال بھر میں ہی اس نے اپنے جیکل بوائے کی نہایت عمدہ کارگزاری سے خوش ہو کر اپنی انویسٹ منٹ کو دوچند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے شاباش لکھی۔ بہت خوب جا رہے ہو، جیکل مائی ڈیئر۔ ہمارا فنانس کا دھندا ایسے ہی چلتا ہے۔ ہم ڈالر لے کر ڈالر ہی بیچتے ہیں، یعنی، لاؤ، دو ڈالر دو اور یہ لو ایک ڈالر لے لو، اور لینے والے کو لگے ہم کتنا سستے میں بیچ رہے ہیں۔ شاباش، جیکل بوائے، تمہاری سفارش کے مطابق اپنا سرمایہ دگنا کر دینے میں مجھے کوئی عذر نہیں، اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سالانہ میٹنگ میں اپنے اس فیصلے کا فارمل اعلان کرنے کے لئے میں ہندوستان آ رہا ہوں۔

لالہ سادھو رام نے ہٹ مین اور اس کی سکریٹری کو اپنے ساتھ ہی چکور والا کے گیسٹ ونگ میں ٹھہرانے کا طے کر رکھا تھا۔ جیکل نے اپنے باس کی ترجیحات کے خیال سے کہا بھی تھا کہ ہوٹل کی بکنگ ٹھیک رہے گی، مگر لالہ نے اسے ہوٹل کی بکنگ سے روک دیا تھا۔ "اب ہم ایک ہی فیملی ہو گئے ہیں تو ہمارا گھر کیا مسٹر ہٹ مین کا بھی نہیں؟"

جیکل سمجھ نہ پایا کہ لالہ اور ہٹ مین کی فیملی ایک ہی کیسے ہو گئی۔

"مسٹر ہٹ مین تو نیویارک میں بھی ہوٹل میں ہی رہتا ہے۔" اس نے لالہ کو بتایا۔

لالہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیوں، کیا اس کا کوئی گھر نہیں؟"

"کیوں، وہیں ہوٹل میں ہی مسٹر ہٹ مین نے اپنا گھر بنا رکھا ہے۔" جیکل کو لالہ سادھو رام کے تعجب پر تعجب ہونے لگا۔ "بڑے آرام کا گھر ہے۔"

"ہاں ہاں، ساری بات تو آرام کی ہے، سو وہ جہاں بھی ملے۔"

لالہ سادھو رام نے بھی دلّی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے لئے مستقل طور پر ایک لگژری اپارٹمنٹ بک کر وا رکھا تھا، جس میں اس نے بھگوان کی مورتی ستھاپت کی ہوئی تھی اور جب بھی گھر اور پیشے کی الجھنوں سے اس کا جی گھبرانے لگتا وہ سب کچھ تیاگ کر، اپنے گھر بار سے بے لاگ ہو کے کچھ اس مانند فائیو اسٹار ہوٹل کا رخ اختیار کر لیتا جیسے پراچین رشی منی جنگلوں کی اور ہو لیتے تھے۔

"جا تو رہے ہو۔" اس کی بیوی اسے چھیڑا کرتی تھی۔ "مگر بھگوان کو اکیلا وہاں چھوڑ

رکھا ہے۔ کون جانے وہ بھی اپنی مورتی وہیں چھوڑ کے من لگانے کہیں نکلا ہوا ہو؟"

"ایسا کیسے؟ میں جب بھی جاتا ہوں بھگوان میری راہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔"

"مجھے بھی ساتھ لے جاؤ تو جانوں۔"

"تم یہاں ساتھ ہو، اسی لئے تو گھر کے مندر کی مورتی پتھر کی ہے۔"

چکور ولا دلی کی آبادی سے پچیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر اپنے نام کی مطابقت سے چاروں طرف یکساں سراپا لئے زمین میں مضبوطی سے پاؤں گاڑ کر کھڑا تھا اور آس پاس کی کئی ایکڑ زمین پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ ہوائی اڈے سے ولا پہنچ کر اوشا سادھو رام انہیں گیسٹ ونگ میں لے جانے سے پہلے گھر کے مندر میں لے گئی جو ولا کے سائے میں ایک طرف نامعلوم گیتا کے کس ادھیائے کا پاٹھ کرتے ہوئے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

جب وہ مندر میں داخل ہوئے تو پجاری نے بھگوان کو بھول کر ہٹ مین کے چہرے پر اتنی شردھا اور بھگتی سے ٹکٹکی باندھ لی کہ پینکی کو خطرہ لاحق ہونے لگا کہ وہ کہیں پاگل نہ ہو۔

اوشا سادھو رام نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہار تھما کر کہا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بھگوان کو ہار پہنائے، جو فرض ادا کرنے کے بعد ہٹ مین نے مورتی کو بغور دیکھتے ہوئے رائے دی۔ بڑی قیمتی مورتی ہے اوشا جی۔ نیویارک میں کم سے کم ایک سو ہزار ڈالر پر اٹھے۔"

"مورتیاں خود آپ نہیں اٹھتیں مسٹر ہٹ مین۔" اوشا کی بیٹی کمو نے اسے ٹوکا۔ "ہندوستان میں ہم ہی مورتیوں کے سامنے اٹھتے بیٹھتے ہیں۔"

ہٹ مین کمّو کے اس تابناک مشاہدے پر چونک پڑا۔ گڑیا سی خوبصورت عورت ہے اور منا سا نام ہے کمو، مگر کتنی بڑی باتیں کرتی ہے۔ "مس لالہ، کیا سبھی ہندوستانی عورتوں کے نام اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ کمو اور مسز لالہ کا نام۔ اوشا......؟"

"ہمارے ہندوستان میں لمبے چوڑے نام صرف مردوں کے ہوتے ہیں......"

"ہاں، جیسے مسٹر لالہ سادھو رام......"

"نام تو تمہارا بولنے سے بھی منہ بھر جاتا ہے مسٹر ولیم ہٹ مین۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "مگر مجھے چھوٹا سا ولی بہت پسند ہے۔ کاروباری میٹنگوں میں اپنا پورا نام سن کر مجھے اپنا آپ اپنے اولڈ ٹائم باپ داداؤں میں سے کوئی برٹش معلوم ہونے لگتا ہے۔"

کمو ہنس دی۔ "امریکی مجھے اسی لئے اتنے اچھے لگتے ہیں۔ جوں جوں بڑے ہوتے جاتے

ہیں اپنا نام چھوٹا کیے جاتے ہیں۔"

"ہاں مس لالہ، ہر وقت کسی لمبے چوڑے نام کا بوجھ سنبھالے رکھنے والا آدمی سدا ہانپتا رہتا ہے۔"

کمو کھلکھلا کر ہنس پڑی تو ہٹ مین کو بہت پیاری لگنے لگی۔ وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"آؤ، مسٹر ہٹ مین، میں تمہیں گیسٹ ہاؤس چھوڑ آتی ہوں۔"

جب وہ مندر سے باہر نکل رہے تھے تو ان کی پشت پر نظر جمائے اوشا سادھو رام کا پہلے سے ہی خوب پیڈ کیا ہوا سینہ فخر سے اور ابھر آیا۔ ہماری بیٹی کتنی بے دھڑک ہے، نری پری امریکی۔

چوکور ولا کا گیسٹ ہاؤس ولا کے عقب میں واقع تھا۔ راستے میں آگے پیچھے طویل و عریض رقبے میں بڑے اہتمام سے ہموار کی ہوئی رہگزاروں کے کناروں پر پھولوں کے انبوہ دھکم دھکا کے عالم میں ایڑیوں پر کھڑے ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ولیم ہٹ مین کو پھولوں کی یہ پوری بھیڑ بیک وقت اپنے ذہن میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی اور اسے بہت بھلا لگا۔

"اتنے پھول میں نے زندگی بھر نہیں دیکھے۔ کیا مسٹر لالہ انہیں ایکسپورٹ کرتے ہیں؟"

"میرے دماغ میں تو اتنی بھیڑ دیکھ کر دتی کے ایک کروڑ لوگ گھس آتے ہیں اور وحشت ہوتی ہے، مگر پتا جی کہتے ہیں کہ......"

ہٹ مین اس کے منہ سے پتا جی سن کر بے اختیار اس لفظ کی صدائی سازش میں مبتلا ہو گیا۔ "پتا؟۔ اسی لفظ میں ایک شادماں چھلاوہ سا ہے۔" وہ کمو سے پوچھنے لگا۔ "کیا یہ تمہارے ڈیڈی کا گھریلو نام ہے؟"

"نہیں، غیر گھریلو!" کمو بولی۔ "گھر میں وہ ہوتے ہی کب ہیں۔ میرا مطلب ہے، گھر میں اپنا دفتر کھولے رہتے ہیں۔"

"بڑا اچھا لفظ ہے۔ پتا جی!۔ کیا مسٹر لالہ مجھے اجازت دے گا، میں بھی اسے پتا جی کہہ کر بلاؤں؟"

"میں کیا بتاؤں؟" ہٹ مین کی خواہش پر وہ شاید یہ سوچ کر مسکرا دی کہ کیا وہ اسے اپنے شوہر کے روپ میں قبول کر سکتی ہے۔ "تم خود ہی پوچھ دیکھو۔" پھولوں کی بھیڑ بھاڑ

سے اسے پھر وحشت ہونے لگی۔ "کیا تمہیں بھی بھیڑ سے گھبراہٹ نہیں ہونے لگتی۔ میں کبھی شہر میں جا نکلتی ہوں تو ہجوم کے ہجوم سر پر چڑھے آتے ہیں۔"

ہٹ مین نے اسے ٹوک دیا۔ "نہیں، مس لالہ آدمی تو قدرت کا سپر کمپیوٹر ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان نے اسے ٹریڈ وردی بنانے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ مال ساتھ ساتھ بکتا نہ رہے تو افراط قلت سے بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔"

"سٹف! کیا آدمی بھی کوئی بکنے کی شئے ہے؟"

"وائی ناٹ؟ نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہ ہو۔" اپنے منہ کو اتنی باتوں سے بھرا پا کر ہٹ مین کو خفیف سا خیال آیا کہ میں اسے دل تو نہیں دے بیٹھا؟...... وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا...... تو پھر میں سانس کیونکر لے رہا ہوں؟ "ہم جہاں جو بھی بیچتے ہیں مس لالہ، وہاں دراصل اپنا ہی بھاؤ تاؤ کرتے ہیں۔"

"تم تو میرے باپ کے بھی باپ معلوم ہوتے ہو، مسٹر ہٹ مین۔"

"اسی رعایت کی بدولت تو۔ کیا کہا تھا تم نے؟۔ وہ۔ پتا جی کی اتنی خوبصورت بیٹی کی رہبری میں مزے سے گھوم پھر رہا ہوں۔" اسے اپنے نیویارک کے بزنس کونسلر کی تنبیہ یاد آئی جو اس نے اسے جین آسٹن کا کوئی ناول پیش کرتے ہوئے کی تھی۔ یہ ناول پڑھ لو اور ہندوستانی عورتوں سے ملاقات پر ہمیشہ اتنی جگہ درمیان میں بنائے رکھو کہ ان کے والدین کھڑے ہو سکیں۔ وہ ناول ہٹ مین نے اسی دم اپنے کونسلر کو لوٹا دیا تھا۔ نو، اولڈ بوائے، اتنا لمبا ناول مجھے پڑھنا ہو تو تمہیں کس بات کی تنخواہ دیتا رہوں؟ تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے...... مگر اس وقت اس کی سمجھ جواب دے رہی تھی۔ یہ حسینہ مجھے فاصلے پر ہی رکے تھمے پا کر سوچے گی مجھے ٹھیک نمبر کے جوتے پہننے کی بھی تمیز نہیں۔ وہ ہنس پڑا، جس پر کمو نے کچھ کہنے کو منہ ابھی کھولا ہی تھا کہ وہ دونوں گیسٹ ہاؤس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ بلیک برڈ پہلے ہی یہاں پہنچ کر دروازے پر اپنے باس کا انتظار کر رہی تھی۔

"سو لانگ، مسٹر ہٹ مین، ٹل وی میٹ ایٹ ڈنر۔" لالہ سادھو رام نے آج شام کو اسے اور بلیک برڈ کو فیملی ڈنر پر مدعو کر رکھا تھا۔ "اپنی بحث ہم وہیں پوری کریں گے۔"

"یس، مس لالہ، سو لانگ!"

کمو منہ موڑتے ہوئے رک گئی۔ "بھوک بچا کر رکھنا۔ ہمارا ویجی ٹیرین فوڈ کھا کر تم

جانداروں کو کھانا بھول جاؤ گے۔"

ہٹ مین اس کی پیٹھ پر آنکھیں ٹکائے اپنا خالی منہ ہلائے جا رہا تھا۔

(۳)

ہٹ مین اور بلیک برڈ دونوں اپنے سویٹ میں داخل ہوئے تو سیکریٹری نے اپنے مالک کو حکم دیا، اب تم اچھے بچوں کی طرح تھوڑی دیر آرام سے سو جاؤ۔

"ہاں، برڈی، اپنے میزبانوں سے بھلی بھلی باتیں کر کے میرا منہ اکڑ گیا ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ میرے ساتھ چند بری باتیں کر کے منہ ڈھیلا کر لو۔"

"لاؤ، پہلے میرے لئے ایک کراؤن وہسکی تیار کر کے لاؤ۔" سویٹ کے پارلر میں ہٹ مین کی نظر سب سے پہلے بار کاونٹر پر پڑی تھی۔ "معلوم ہوتا ہے لالہ راسکل اِس لئے ٹی ٹوٹلر ہے کہ اوروں کو نشے میں دھت کرتا ہے اور اِس طرح اُس کے دل میں اپنی وقعت اور بڑھ جائے۔"

جتنی دیر ہٹ مین کھڑے سویٹ کا جائزہ لیتا رہا، بلیک برڈ دو گلاسوں میں وہسکی بھر لائی۔ ہٹ مین اُس سے ایک گلاس پکڑ کر صوفے میں دھنس گیا اور ایک ہی ڈیک میں وہسکی کا اتنا بڑا پیگ خالی کر دیا۔ "اور!"

"اِس شرط پر، کہ کپڑے اتار کہ ایک دم سو جاؤ گے۔" وہ اُس کے لئے ایک اور پیگ تیار کرنے کے لئے بار کاؤنٹر کی طرف مڑ گئی۔ "دائیں طرف ہمارے لئے دو نہایت کوزی بیڈروم ہیں۔"

"ایک ہی کیوں نہیں؟ ہم کوئی میاں بیوی ہیں جو الگ الگ سوئیں؟" ہٹ مین نے اُس کی پیٹھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آؤ، سو جائیں، دوسرا پیگ رہنے دو۔"

"نہیں، اب پی ہی لو۔" بلیک برڈ نے سوچا کہ نشے میں غنودگی ذرا بڑھ جائے گی تو وہ آرام سے سو جائے گا۔

ہٹ مین اچانک کچھ سوچ کر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "برڈی میری بیوی حرافہ نیویارک میں اپنے پچھلے شوہر کے ساتھ گل چھرے اُڑا رہی ہو گی۔" ہٹ مین کی یہ تیسری شادی تھی...... "اور......"

اور...... اور...... برڈی نے خوش ہو کر سوچا...... اِس کرسمس تک تو ان کی طلاق

انجام پا ہی جائے گی...... پھر...... وہ اُسے وھسکی کا گلاس تھما کر اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی...... پھر کیا؟...... مارکیٹ اوپن ہو تو اتنا بڑا فنانسر ایسا سنہری موقع کہاں کھوتا ہے؟...... برڈی کا باپ اگرچہ گھپ نیگرو تھا مگر اُس کی ماں تڑک گوری، سو وہ کسی سنہری موقع سے ہرگز کم نہ تھی، چہرہ پکے تانبے کی پوری تاب لیے ہوئے اور بال ہر چند کہ سیدھے، تاہم بڑی دلآویزی سے چھلا چھلا بھی۔ ایک دفعہ نیویارک میں جب آزادیٔ نسواں پر تقریر کرتے ہوئے اُس کے رخسار تمتما اٹھے تھے تو ہٹ مین نے اُسے تنبیہہ کی تھی، اپنے آپ کو سنبھال کے رکھو برڈی، میں ہر من پسند شئے کو خرید لیتا ہوں، اور شئے اگر ذی جان ہو تو ظاہر ہے، اُس کی قیمت اُسے ہی ادا کرتا ہوں تاکہ ادائیگی کی رقم بھی میری ہی ملکیت میں رہے......

ڈیوَل اِن کارنیٹ!...... برڈی نے بڑی محبوبیت سے اُسے جواب دیا تھا اور وہ ساری رات اُسی کے ساتھ گزاری تھی۔

ہٹ مین نے اپنا دوسرا گلاس بھی جھٹ چڑھا لیا اور پھر اِسے برڈی کی طرف بڑھا کر کہا۔ "ایک اور لاؤ۔"

"نہیں، اور نہیں! چلو اب میں تمہیں سلا دیتی ہوں۔"

وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کی کمر میں باہیں ڈال کر بغل کے بیڈ روم میں بستر پر آگرے اور برڈی اُس پر جھکے جھکے اُس کا سر بھی سہلاتی رہی اور اُسے چوم چوم کر امریکی نیگروں کی وہ جادوئی لوری بھی گنگناتی رہی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ نیند کے غلبے میں جب عاشقوں کے تحت الشعور میں محبوباؤں کی آواز راہ پا لیتی ہے تو وہ جاگتے میں بھی اُن کے پیچھے اِسی طرح بھاگتے پھرتے ہیں جس طرح سوتے میں۔

ہٹ مین جھٹ ہی سو گیا، مگر وہ اپنی آنکھیں ویسے ہی کھولے ہوئے تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لاش بہ چشم وا بدستور سانس بھر رہی ہے۔ بلیک برڈ نے جب اُسے پہلی بار اِس حالت میں پایا تھا تو خوف سے چیخ مار کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی، مگر اب وہ عادی ہو چکی تھی، لہٰذا بڑے اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اُس نے ہٹ مین کی آنکھیں آہستگی سے بند کر دیں، مانو بتی بجھائی ہو۔

"ڈاکٹر۔" ہٹ مین کے سائی کی ایٹرسٹ نے جب اُس کے پہلے وزٹ پر اُس کے اِس مرض کے تعلق سے تفصیلات بیان کرنے کو کہا تھا تو اُس نے بتایا تھا۔ "میں سو تو رہا ہوتا

ہوں، لیکن مجھے سب کچھ ہو بہو نظر آرہا ہوتا ہے......"

"تو پھر تم سو کیونکر رہے ہوتے ہو؟"

"جیسے تم سوتے ہو، ڈاکٹر، لیکن چونکہ میں دیکھ بھی رہا ہوتا ہوں اِس لئے جو سچ مچ دیکھ رہا ہوتا ہوں وہ مجھے خواب میں ہی دِکھ رہا ہوتا ہے......"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"نو، ڈاکٹر، نو! میری پچھلی بیوی بھی یقین نہ کرتی تھی مگر ایک دفعہ جب میں نے اُسے بہ تفصیل بتایا کہ وہ کیونکر اپنے ایک عاشق کی گود میں جا بیٹھی تھی اور پھر وہ دونوں کیسے ایک دوسرے کے بدن میں گھستے جارہے تھے تو اُس کا ماتھا ٹھنکا اور مجھ سے جلدی جلدی معذرت مانگ کر اُس نے تجویز کیا کہ میں فوری طور پر کسی ڈاکٹر سے رجوع کروں......"

ڈاکٹر نے ایک مدت تک اُس کا علاج کیا اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا تو اُسے یہ رائے دے کر کیس کلوز کردیا کہ جب وہ کھلی آنکھوں سے سو رہا ہو تو کوئی آہستگی سے اُس کی آنکھیں بند کردے، اور یہ طبی مشورہ واقعی کارگر ثابت ہوا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی وہ...... ننھا منا ساوِلی کہیں اندھیروں سے دوڑتے ہوئے وارد ہو کر اپنی ماں کی گود میں آگرتا اور اُس کی ماں اُسے چوم چاٹ رہی ہوتی تو ماں بیٹے کی شبیہہ دھیرے دھیرے اندھیروں کی بڑی میٹھی حدت میں اتر جاتی اور نیند ہی نیند میں اُسے اپنے کچھ بھی نہ ہونے کا نہایت راحت آگیں، نہایت سبک احساس ہونے لگتا اور پھر نا معلوم اجالا ہوتا، یا اندھیرا، اُس کی بند آنکھوں کے سامنے پہاڑ، میدان، سمندر، آکاش...... دو جہاں آپ ہی آپ ابھر آتے اور اُسے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے وجود کی بجائے انہی میں موجود ہے، یا نہ جانے، کیا؟...... مگر اُس کی نیند گہری ہوتی چلی جاتی، شعور خراٹے بھرنے لگتا اور تحت الشعور میں اُس کی اوّلین نیکیاں رنگ برنگی تتلیوں کی صورت بھولے بھالے بکھر آتیں اور سو لینے کے بعد جب اُس کی آنکھ کھلتی تو وہ مسکرا رہا ہوتا۔

ایسا ہوتا تو نہ تھا کہ اُس کی سیکریٹری یا کوئی اور...... بیوی پر اُسے بھروسہ نہ تھا...... اُس کے سو جانے پر اُس کی آنکھیں بند نہ کرے، لیکن کبھی کبھار اتفاق سے ہو جاتا تو جاگنے پر ہٹ مین کو لگتا کہ وہ سویا ہی نہ تھا۔ اُس نے اپنی دوسری بیوی کو اِسی لئے طلاق دی تھی کہ اُن کی کسی بات پر ٹھن جاتی تو وہ اُسے سزا دینے کے لئے اُس کی آنکھیں کھلی چھوڑے رکھتی۔

"میں دراصل ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں برڈی" اُس نے ایک دفعہ اپنی سیکریٹری سے کہا تھا۔ "جو مجھے ہر رات ایک چھوٹی سی موت کے گھاٹ اتار دے۔" پھر وہ، آپ ہی آپ ہنسنے لگا تھا۔ "شاید اسی لئے مجھ سے شادی کے خیال پر ہر عورت پھولا نہیں سماتی۔"

"یو آر اے ویری ڈیئر راسکل، ولی۔" ہٹ مین کی سیکریٹری نے اُس کے کندھوں پر اپنی دونوں باہیں ڈال دی تھیں۔ "آؤ اب ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جائیں۔"

"مگر تم بھی سو گئیں برڈی، تو میں کیسے سو پاؤں گا؟"

برڈی کے ذہن میں یہ ڈر کہیں سے سانپ کی طرح رینگ کر گھس آیا تھا، میں اِس آدمی کو شادی کے لئے رام تو کرتی رہتی ہوں، تاہم ہماری شادی ہو گئی تو مجھے ساری عمر آنکھوں میں گزارنا پڑ جائے گی۔

(۴)

لالہ سادھو رام نے کمپنی کے چیف پی۔ آر۔ او۔ ڈی سوزا اور ہٹ مین کے نمائندہ خاص جیکل کو بھی اِس خیال سے اپنے فیملی ڈنر پر مدعو کر رکھا تھا کہ پرسوں بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے۔ اِس گھریلو ڈنر پر بھی شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ ڈی سوزا کے ساتھ اُس کی خوش پوش شام رنگ بیوی پای بھی آئی تھی، آرائشی پیکنگ میں الکوہلک چاکلیٹ سی، جو گذشتہ زچگی پر ایک مُردہ بچہ جننے کے بعد اور نشہ آور نکل آئی تھی۔ جیکل لالہ سادھو رام کی اجازت سے اپنے ساتھ اسکول آف اکنامکس کی ناکتخدا، پرنسپل مس ہودی کو لے آیا تھا جو دو ایک ملاقاتوں میں ہی جیکل پر اس لئے عاشق ہو گئی تھی کہ خوش باش امریکی، اکیلا ہے، اور اِس سے بڑھ کے یہ، کہ ہمیشہ اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کے یہ، کہ شاید اُس کے ذریعے امریکہ میں مستقل رہائش کی کوئی صورت نکل آئے۔ لالہ سادھو رام نے اپنے پریوار کے گورو شری شری امباجی مہاراج کو بھی اشیرواد کے لئے بھوجن پر بلا رکھا تھا۔

لالہ سادھو رام نے چو کور وِلا کی وِشال بھومی کے ہی ایک کونے میں ایک ٹیلے پر شری شری مہاراج کے لئے آشرم بنوا رکھا تھا اور مہاراج کی اچھا انوسار وہاں جنگل کا سماں باندھ کر ایک ہرنی اور دو ہرن چھوڑ رکھے تھے۔ یہ دونوں ہرن ہرنی سے بھوگ ولاس میں

پہل کے لئے ایک دوسرے کے سینگوں میں سینگ ڈال کر لڑتے بھڑتے رہتے اور شری شری مہاراج اُس سمے تک ہری اوم، ہری اوم کا پاٹھ کرتے ہوئے اُنہیں دیکھ دیکھ کر اَتی پرسن ہوتے جب تک ایک، دوسرے کو پچھاڑ کر ہرنی کو اپنے آگے لگا کے پرے پار کی جھاڑیوں کی اور نہ ہو لیتا۔

اپنی سیکریٹری کے پیچھے پیچھے ہٹ مین جب لالہ سادھو رام کی پارلر میں داخل ہوا تو کمو کی طرف نظر اٹھنے پر تھم کر رہ گیا۔ کمو کے چاندنی بھرے چہرے کے عقب میں اُس کے کھلے سیاہ بال آبشار کی طرح اُس کی پیٹھ سے کولہوں تک پھسل کر گھٹنوں میں نا معلوم کہاں جا غائب ہوئے تھے۔

"اتنے لمبے اور اتنے سیاہ، جیسے ......"

"جیسے ؟...... "ہٹ مین سے پوچھتے ہوئے کمو کا گیلا گیلا پورا چاند گویا آبشار پر کھنچ آیا۔

"جیسے ......" ہٹ مین کو اپنی کوئی اسکول ٹائم کہانی یاد آ گئی۔

"جیسے کوئی درجن گاڈیسیس اچانک اپنی داستان سے باہر نکل آئی ہوں۔"

اتنے میں کمو کی ماں وہاں آ کر اُن کے درمیان آ کھڑی ہوئی اور ہٹ مین نے اپنے امریکی کونسلر کی ہدایت کے مطابق اُس کی ماں کی جگہ کھلی کرنے کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹا لیا۔ "میں مس لالہ سے پوچھ رہا تھا او شا جی، اُس نے دن کی ملاقات پر ابنے اتنے سارے بال کہاں چھپے رکھے تھے ؟"

"اپنے سر میں، اور کہاں۔" اُسے اتنی حیرت میں پا کر کمو کو اُسے مزید حیران کرنے کی تحریک ہونے لگی۔ "ابھی اور بھی کئی تہیں سر کے اندر جمار کھی ہیں۔"

"کیسے ؟" ہٹ مین کی آنکھوں میں نیویارک کے کسی ہوٹل میں حال ہی کا دیکھا ہوا ایک سٹرپ ٹیز شو گھوم گیا جس میں ایک لڑکی ناچ ناچ کر اپنے بدن کے کپڑے اتنے اشتہائی انداز سے اتارتی جا رہی تھی کہ تماشائی کی نظر بدحواس ہو کر اُس کے باقی انگوں کا جامہ خود ہی تار تار کرنے لگتی تھی......اب!......اور اب!...... مگر یہ لڑکی تو ہر "اب" کے بعد اپنے لباس کو اور بھاری کر لیتی ہے...... ہٹ مین اپنے سر کو کھجانے لگا...... "کیسے ؟" اب کے شاید اُس نے خود سے ہی پوچھا تھا۔

"کیسے کیا؟" یہاں سے تمہاری روانگی سے پہلے اپنے بال کٹوا دوں گی، اور پھر اپنی واپسی

پر دیکھ لینا، کیسے اِس سے بھی لمبے اگ آئے ہوں گے۔"

ہٹ مین نے اپنے آپ کو تھام کر جواب دیا۔ "مگر میں تو اگلے ہی ماہ پھر آ رہا ہوں مس لالہ۔"

"کیا واقعی؟" کمو کی ماں نے خوشی کا اظہار کرنے کے لئے پوچھا۔ اِسی دوران کہیں سے لالہ سادھو رام بھی اپنے گورو شری شری مہاراج کو ساتھ لئے آن وارد ہوا اور اُن کے پیچھے پیچھے جیکل اور ہوڈی بھی۔

"ویل کم، مسٹر ہٹ مین۔" لالہ سادھو رام نے اپنے گورو کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمارے گورو دیو شری شری مہاراج سے ملو۔"

ہٹ مین کو اُس کے امریکی کونسلر نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں گیروے کپڑوں والوں سے ملاقات پر ہمیشہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اُن سے ملو، چنانچہ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنا سر جھکا لیا اور گورو دیو مہودھے نے پرسن ہو کر اپنا دایاں ہاتھ سیدھا اٹھا کے کچھ اِس مانند خالی ہتھیلی کھول دی جیسے اُس میں سے دو جہان کا ہن برس رہا ہو۔

کمو گورو مہاراج کی چہیتی تھی اور کچھ بھی بول دیتی تھی۔

"گورو دیو۔" وہ، گورو دیو سے اس لئے انگریزی میں مخاطب ہوئی تھی کہ اُس کی بات ہٹ مین کی سمجھ میں آنے سے نہ رہ جائے۔ "اندرا گاندھی کے الیکشن سمبل کا سہارا کیوں؟ کیا مسٹر ہٹ مین کا ووٹ مانگا جا رہا ہے؟"

"بڑی چنچل ہو، سُپتری۔" گورو دیو کی پلی ہوئی دیسی ڈاڑھی مونچھوں میں اُس کا منہ کسی معجزاتی غار کے سوراخ کی طرح کھلا۔

ہٹ مین اپنے جوڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کرنا بھول گیا تھا جس سے بلیک برڈ پریشان سی ہونے لگی تھی، اُسے یاد دلانے کے لئے اُس نے آگے بڑھ کر اُن پر اپنا کیمرہ کھول دیا۔

"آیئے!" ہوسٹس نے سبھوں کو صوفوں کی طرف بڑھ آنے کا اشارہ کیا۔

لالہ سادھو رام اور ہٹ مین نے ایک وسیع تر مرکزی صوفے کی طرف قدم بڑھائے اور اوشا سادھو رام کے مؤدب اشارے پر شری شری مہاراج کو ایک سنگل سٹیر پر براجمان ہوتے پا کر دوسرے بھی جہاں جگہ ملی، بیٹھ گئے۔

جیکل موقع ملتے ہی ہٹ مین کو اپنی دوست پرنسپل ہوڈی سے متعارف کرانے لگا۔

"یہ میری دوست پرنسپل ہوو ی ہیں، مسٹر ہٹ مین، ایشیائی اقتصادیات کا ایک بڑا نام!"

"چھوٹے نام اکثر بہت بڑے ہوتے ہیں۔"

ہٹ مین کا یہ جملہ سن کر ہووی بیک وقت عالم اور محبوب نظر آتے ہوئے پھیلنے اور سمٹنے لگی...... دا براؤن بچ!...... ہٹ مین نے جی ہی جی میں کہا اور بولا۔ "میں نے کئی بار سوچا کہ اپنے نام میں صرف ہٹ رہنے دوں، یا صرف مین، مگر میرے تعلقات عامہ کے امریکی چیف نے مجھے روک دیا......" اُس کی نظر اچانک ڈی سوزا پر پڑ گئی جو اپنی بیوی سے جڑ کر اُس کی توجہ کا منتظر بیٹھا تھا۔ اُس نے گویا ڈی سوزا سے ہائی، کہنے کے لئے اُس سے پوچھ لیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے ڈی سوزا؟"

ڈی سوزا کا کوئی خیال نہ تھا، سو اُس نے اپنے سر کے اندر ہی سر جھٹک کر دہی کہا جو کہنے کا انتظار کر رہا تھا۔ "یہ میری بیوی ہے سَر...... پامی......"

"ہائی، پامی!" ڈی سوزا کی بیوی اُسے گھڑ گھڑ کر وضع کی ہوئی مورت سی لگی جس پر اُس کے بالے شوہر کی تعریفی نظریں بیس بال کھیلتے ہوئے ہوم رَن بنائے جا رہی تھیں۔ حالانکہ ہٹ مین کو بلہ پکڑنا بھی نہ آتا تھا پھر بھی اُسے ہر رات کوٹی۔ وی پر بیس بال دیکھنے کا اتنا شوق تھا کہ اُس کی پہلی بیوی سونے کے لئے اکثر کسی اور کمرے میں چلی جاتی۔

"تمہارے ساتھ سونے سے تو یہی بہتر ہے کہ اپنے ساتھ ہی پڑی رہوں۔"

"نو مائی ڈیر وائف، کیا تم خود کو اتنا گیا گزرا سمجھتی ہو؟"

ہٹ مین کو اچانک خواہش ہونے لگی کہ وہ بھی ڈی سوزا کی طرح کسی عورت پر نظر جمائے اُسے اپنا آپ سونپ دے، مگر کسے؟...... بلیک برڈ کو؟...... وہ تو اُس سے بھی پہلے اُسے دیکھنا شروع کر دیتی ہے...... پرنسپل ہووی کو؟...... وہ اپنی ہی نظر کی آڑ میں او جھل ہے...... اُس نے مسز لالہ کی طرف دیکھا جس کی تجربہ کار مسکراہٹ صرف اُس کے منع کوش لالہ کی وجہ سے اُس کا ریپ کرنے سے احتراز کر رہی تھی...... وہ کسی کو بھی اپنا آپ سونپ دینا چاہتا تھا، مگر کسے؟...... اُس کی آنکھیں کمو کی بے دھڑک آنکھوں سے ٹکرا گئیں اور اُس کے بالوں میں اوندھی جا گریں۔

لالہ سادھو رام کا سیکریٹری ایک فائیل لے آیا اور اِسے لالہ کو پیش کیا۔ لالہ نے اِسے ہٹ مین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اِس میں پرسوں کی میٹنگ کا پروگرام ہے مسٹر ہٹ

مین اگر کوئی ترمیم کرنا چاہو تو، ابھی کر لیتے ہیں۔"

ہٹ مین فائیل لے کر بولا۔ "ترمیم کیوں؟" اور اِسے بلیک برڈ کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے کسی سخت ترین ڈرنک کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" ہٹ مین ڈرنے لگا تھا کہ لالہ سادھو رام اُنہیں سوکھے سوکھے ہی ویجی ٹرین فوڈ کی میز پر نہ ہانک لے جائے۔

عین اِسی دم دو باوردی بیرے ڈرنکس کے ٹرے سنبھالے آگئے۔

"وِدھ سوڈا سر؟"

"نو، نیٹ، انیڈ تھری اِن وَن۔" ہٹ مین نے بیرے کو ہدایت کی۔

شری شری مہاراج کے لئے چاندی کے گلاس میں بھنگ کی لسی آئی اور لالہ درگا داس کے لئے فالسے کا شربت جو لالہ اپنے گورو کے مشورے پر بلاناغہ لیا کرتا تھا، اور اوروں کے لئے، جو چاہو لے لو۔

"نو، نیٹ!" کمو کو سن کر اُس کی ماں نے اُسے روک دینا چاہا۔ "نہیں، کمو، میری طرح سوڈا ملا کر پیو۔"

"تمہاری مشکل یہ ہے ممی، کہ تم نرم بھی پی جانا چاہتی ہوں اور سخت بھی۔"

اِس لڑکی کو کب عقل آئے گی؟...... مسز لالہ نے سوچا...... سب کے سامنے جو منہ میں آئے، بک دیتی ہے۔

"تمہاری ممی کی ترجیح یہ ظاہر کرتی ہے۔" ہٹ مین کمو کو بتانے لگا۔ "کہ وہ ہمارے یو. ایس. اے کی نہایت مناسب پریذیڈنٹ ثابت ہوں گی۔"

ہٹ مین کو سن کر مسز لالہ فرط مسرت سے اپنی بیٹی سے بھی چھوٹی معلوم ہونے لگی۔

"ری آلی؟!"

"تم کبھی ہماری دیسی ڈرنک بھی پی کر دیکھو، مسٹر ہٹ مین۔"

شری شری مہاراج نے اُس کی طرف اپنا گلاس بڑھا کر کہا۔ "چیئرز!"

"چیئرز!" لالہ سادھو رام بھی اپنا فالسے کا گلاس سب سے اونچا کر کے بولا۔

"میں نے سن رکھا ہے کہ انڈیا کے ہولی مین اتنی نشہ آور ڈرنک لیتے ہیں۔" ہٹ مین اُس سے پوچھنے لگا۔ "کہ گاڈ آل مائٹی جہاں بھی ہو وہاں سے دوڑ کر اُن کے سامنے آبیٹھتا ہے؟"

"ہاں، تمہیں بھی گاڈ کے درشن کرنا ہو تو ہماری یہ ڈرنک پی کر دیکھو۔" شری شری مہاراج اُسے بتانے لگا۔

"ہمارے دیوتا لوگ اِسے سوم رس کہا کرتے تھے۔"

"تو، ریورنڈ شری شری مہاراج، تھینک یو! اگر گاڈ آل مائٹی کو میر اسراغ مل گیا تو میری بنی بنائی بزنس ایمپائر پر ریجھ کر وہی اِس پر قبضہ کر لے گا۔" وہ سب کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ "میں تو اپنے ملک میں بھی اِسی لئے گرجوں سے دور رہتا ہوں۔"

"نہیں، مسٹر ہٹ مین۔" شری شری مہاراج نے اُس سے کہا۔ "گاڈ کی بھگتی کرو تو وہ بھی تمہارا بھگت بن جاتا ہے۔"

ہٹ مین شری شری مہاراج کے جملے کو اپنی سوچ میں گھلتا ہوا محسوس کر کے رک گیا۔ "ونڈر فل! اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ آپ کے ملک میں لوگ لوگوں کی ہی عبادت کیوں کرتے ہیں۔" اُس کا جی چاہا کہ اپنا بیان جاری رکھنے سے پہلے وہ دو چار گھونٹ اپنے حلق سے اتار لے۔ "تھینک یو ریورنڈ مہاراج! روحانی اعتبار سے آپ واقعی ہم سے بہت آگے ہیں۔ ہمارے یہاں عبادتی انڈسٹری اِسی لئے جوکھم میں ہے کہ خدا ہمیں بہت مہنگا دستیاب ہوتا ہے، جب کہ آپ کے یہاں صارفین اپنی سہولت کے مطابق اُسے اپنے ہی قد بد میں گھٹا بڑھا لیتے ہیں، لہٰذا جسے مان لیں، وہی خدا، اور جو بھی قیمت ملے، وہ سارے کا سارا نفع......"

"میں نے پڑھا تھا مسٹر ہٹ مین۔" ڈی سوزا نے اُسے بتایا۔ "کئی لوگ ہمارے یہاں اپنے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ مہاتما گاندھی کی بھی پوجا کرتے ہیں۔"

"اینڈ وائی ناٹ؟" ہٹ مین نے اپنا گلاس شری شری مہاراج کی طرف کر کے اوپر اٹھا لیا۔ "ہیرز فار یوٗر فیوچر، مائی ڈیئر ریورنڈ مہاراج۔"

"ہماری کمو کی طرح مسٹر ہٹ مین بھی بہت چنچل ہے سادھو رام۔" شری شری مہا راج نے اپنے مرید کو مخاطب کر کے اُن دونوں کی جانب دیکھا اور مسکرا کر اپنی بھنگ کی لسی کا گھونٹ بھرنے کے لئے چاندی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"تمہارے نزدیک آدمی بھی بکنے کی شئے ہے مسٹر ہٹ مین، اور خدا بھی۔" کمو کی سرزنش بھی محبوبیت سے مبرا نہ تھی۔ "آخر کچھ تو ہو گا جو بازار سے حاصل نہیں ہوتا۔"

"کیوں، جسے بازار نے نا قابل فروخت قرار دے کر رد کر دیا ہو۔" پتاجی، یاد، آجانے پر اُسے یہ کہہ دینے کی بھی ترغیب ہوئی۔ "یقین نہ ہو تو اپنے پتاجی سے بھی پوچھ لو۔"

"مسٹر ہٹ مین ہمارے دور کی سچائیاں ہی بیان کر رہا ہے بیٹی۔ پہلے راجا راج کرتا تھا اور آج؟...... آج بھی راجا ہی راج کرتا ہے۔" اپنی بات کو کھولنے کے لئے لالہ نے اضافہ کیا۔ "پہلے بھی قدر عامہ کے قانونی یقین کا وہی مجاز تھا جسے فنانس پر کنٹرول ہو اور آج بھی۔"

"مگر پتاجی، آج مرد و زن کو غلام بنا کر کھلی منڈیوں میں فروخت نہیں کیا جا سکتا؟"

"تو اچھا ہی ہے۔ فروخت کی کاسٹ بچ گئی۔" ہٹ مین نے بیرے کو اور وہسکی لانے کا اشارہ کیا۔ "آج ہر کوئی خود آپ ہی اپنی فروخت کی تدبیر کر لیتا ہے...... کیوں، میڈیم ہوو ی؟"...... ہوو ی سے نظریں ملنے پر اُس نے دریافت کر لیا۔

"نہیں میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔" سب نے کان کھڑے کر لئے کہ ملک کی سب سے معزز درسگاہ کی پرنسپل ہے، ضرور کوئی پتے کی بات کہے گی۔ مگر اپنی آواز پر بڑی محبت سے کان دھرے اچانک اُسے لگا کہ وہ اپنے طلباء سے مخاطب ہے سو خطابیہ لہجہ اختیار کر کے اُس نے اپنی بات کو حتمی طور یہیں ختم کر دیا۔ "آج کوڑے مار مار کر کسی کی جان نہیں لی جاسکتی۔"

"تو اس میں کیا مشکل ہے؟ مسکرائیں اور آنکھیں مار مار کر جان لے لیجئے، میڈم!" آنکھوں کے ذکر سے ہٹ مین کو خیال آیا کہ اُسے تادیر نہیں جاگنا چاہیے۔ کل صبح اُسے ایلورہ کیوز دیکھنے اورنگ آباد جانا ہے...... وہ جبلی طور پر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بلیک برڈ نے مسکرانے کے لئے اپنا گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ "میں یہاں ہوں۔"

ہٹ مین نے سوچا کہ اگر وہ نہ ہوتی تو چوبیس گھنٹے کی بیداری سے اُس کا دم اب تک نکل چکا ہوتا۔ "ہاں، تم ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی ہو۔ میں ہی بھول جاتا ہوں۔"

بلیک برڈ نے جی ہی جی میں اُسے جواب دیا۔ واپس سٹیٹس پہنچ کر میرے سوا تمہارے ساتھ کون ہو گا جو مجھے بھول جاؤ۔ یہ لمبے بالوں والی ہندوستانی جادوگرنی تو تمہیں جہاز میں بٹھا کر گھر لوٹنے سے پہلے ہی بھول جائے گی۔

"بات یہ ہے مس لالہ۔" ہٹ مین کمو سے ہم کلام تھا۔ "کہ۔"

"ٹھہرو! پہلے، مجھے یہ بتاؤ، کیا میرا کوئی نام نہیں؟ جب سے آئے ہو مس لالہ، مس لالہ بلا بلا کر بور کیئے جا رہے ہو......" لالہ سادھورام اور اوشا لالہ فخر مندی سے اپنی اکلوتی اولاد کی طرف دیکھنے لگے کہ کتنی خوش اسلوبی سے معزز مہمان کو راہ پر لا رہی ہے۔ اُن کا گورو بھی مطمئن تھا کہ بے تکلفی گٹھ جانے پر کاروبار میں بہت آسانیاں میسر آ جاتی ہیں۔ بلیک برڈ البتہ ذرا فاصلے پر بیٹھی گویا دشت بصارت میں اپنی چاروں ٹانگوں پر کھڑی تھی اور اُس کے کچے گوشت پر منہ مار رہی تھی۔

"اگر تم یہیں رہ رہے ہوتے۔" کمو بولے جا رہی تھی۔ "تو ہم دونوں بڑے اطمینان سے دو چار سال اور مس لالہ اور مسٹر ہٹ مین بنے رہتے، مگر تم تو دو چار دن کے لئے ہی یہاں آئے ہو۔ ہمارے پاس باقی وقت ہی کتنا بچا ہے؟......"

"ہاؤ سویٹ آف یو، کامو؟ میں واقعی بہت امپریس ہوا ہوں۔"

"کامو نہیں، کمو!...... کل صبح میں تمہیں اڑا کر اورنگ آباد لے جا رہی ہوں۔" یہ طے ہو چکا تھا کہ لالہ خاندان سے صرف کمو اُن کے پرائیویٹ کرافٹ میں اُس کے ساتھ جائے گی۔ "ہم سارا دن وہاں ایک دوسرے کو امپریس کریں گے اور ڈنر سے پہلے دلّی لوٹ آئیں گے۔"

(۵)

کمو اور ہٹ مین اودے پور ایئر پورٹ پر بریک فاسٹ کے لئے اترے تھے اور اِس وقت کمو اپنے مہمان کو بادلوں سے بھی اوپر اورنگ آباد کی اور اڑائے لئے جا رہی تھی۔ اودے پور ہوائی اڈے کے ریستوران میں باوردی بیروں نے شوخ خاکی رنگ کی اتنی بڑی بڑی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا سروں پر چمکیلی مٹی کے ٹوکرے اٹھائے ہوئے ہیں۔

ہٹ مین کا دھیان اچانک اُن کی طرف چلا گیا اور وہ کمو سے پوچھنے لگا۔ "بیرے سروں پر لمبے لمبے خاکی کپڑے کس کر منہ کیوں چھپائے ہوئے تھے؟"

"وہ پتا جی کی طرح پگڑی باندھے ہوئے تھے وِلّی۔ پگڑی ہمارے یہاں عزت کی علامت ہے۔"

"مگر اُن لوگوں کو تو عزت سے زیادہ پیسے کی ضرورت ہے۔ تم نے جب اُس بوڑھے

بیرے کو ٹپ دیا تھا تو کس طرح اپنی عزت کو جھکا جھکا کر تمہارے پیروں میں ڈال رہا تھا......"

"مگر......" وہ سٹپٹا سی گئی کہ کیا کہے۔

"مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔" ہٹ مین نے گویا اُس کی مدد کے لئے اضافہ کیا۔ "جس کے پاس بیچنے کو صرف عزت ہو، وہ اور کیا بیچے؟"

"تم امریکی باتیں کرنا بالکل نہیں جانتے۔ بس بحثیں کرتے رہتے ہو، تاکہ اپنی جیت کے پوائنٹ بڑھاتے رہو۔" وہ اپنی کنپٹی کے بالوں پر انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ "تم نے دیکھا، ویجی ٹیرئن فوڈ کتنا لذیذ ہوتا ہے!"

"ہاں، اِس میں کیا شک ہے؟" اُس کا منہ اُس کے کندھوں پر جھکتا چلا آرہا تھا۔

کمو بڑی تیکھی مسکراہٹ سے اُس سے ذرا پرے ہٹ گئی۔ "مگر میں کھانا تو نہیں ہوں، مین اِٹیر۔" اُسے نامعلوم بلیک بوڈ کا خیال کیوں آگیا۔ "جانتے ہو، تمہاری بلیک برڈ کیوں نہیں آئی؟"

"اُس نے کہا تھا، میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔"

"نہیں، اُسے وہیں روکنے کے لئے میں نے تمہارے جیکل کو پٹا لیا تھا۔ تمہارا بہت وفادار ہے۔ کہنے لگا، مجھے یقین ہے میرا باس بھی یہی چاہے گا......"

"ہاں، مجھے سوجھا ہی نہ تھا کہ ہم دونوں کا ساتھ اُسے ایک آنکھ نہ بھائے گا۔ وہ تو میری بیوی کو بھی میرے ساتھ پا کر کڑھنے لگتی ہے۔"

"بیوی؟......"

"ہاں، ٹوموتھی میری تیسری بیوی ہے۔" وہ رک گیا، شاید یہ سوچنے کے لئے، کہ منہ میں آئی ہوئی بات پوری کرے یا نہ کرے۔

رُک کیوں گئے؟"

"تمہاری دوستی حاصل کر کے اپنی نظروں میں میری وقعت یقیناً بڑھ گئی ہے۔" اُسے اپنے لہجے کی ڈرامائیت کھلی۔ "اِس لئے......"

"میں نے تو اِس لئے تم سے دوستی کی ٹھانی تھی...... مگر صرف دوستی......او کے؟...... اِس لئے ٹھانی تھی کہ تمہیں اپنے آپ سے بے حد پیار ہے، اِس لئے چھاپہ مار کر تم سے تمہیں الگ کر دوں۔"

"اور ینٹل میجک، آر فلاسفی، آر سم تھنگ؟......"

"چھوڑو، پہلے یہ بتاؤ، کیا کہتے کہتے رک گئے تھے؟"

"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔" اُس نے خود کو بتایا کہ وہ نرا پرا احمق ہے۔ اتنے غیر مانوس فاصلوں پر بسی ہوئی اِس عجیب و غریب نوبالغ لڑکی کو وہ کیوں کیا بتانا چاہتا ہے؟...... کہ اُس کی تیسری بیوی بھی اُسے چھوڑ کر اپنے پہلے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، کہ وہ بالکل اکیلا ہے، دُکھی ہے، اور اُس کے لمبے بالوں میں منہ چھپا کر رونا چاہتا ہے...... وہ شاید سچ مچ رو دیا۔

مگر کمو نے اُس سے پوچھا۔ "ہنس کیوں رہے ہو؟"

اُسے اپنے کونسلر کے الفاظ یاد آئے:...... ہاں، ایک وارننگ لمبے بالوں والی ہندوستانی عورتیں جادو گرنیاں ہوتی ہیں اور غیر مردوں کے ساتھ سونے کی بجائے اپنی جنسی خواہش بس اِس طرح پوری کرلیتی ہیں کہ اُنہیں مرد سے گھوڑا بنا کر دیکھتی رہیں۔

اب کے وہ واقعی کھل کر ہنسا۔

"کیا تم پاگل ہو گئے و تی؟"

"نہیں، ہوش میں آرہا ہوں۔" اُس نے اپنا سر جھٹک کر کہا۔ "...... ہاں، تو میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ تینوں بار میرا شادی کا تجربہ خوشگوار نہیں رہا، مگر میری سیکریٹری ہمیشہ ثابت قدم اور وفادار ثابت ہوئی۔" وہ کمر سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔ "کیا اِس کا سیدھا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ عورت کو بیوی بنانے کی بجائے بڑی موٹی تنخواہ پر اپنا پرسنل سیکریٹری بنائے رکھو؟...... "واٹ ڈُو یُو سے؟"

کمو نے قہقہہ لگایا۔ "میں کیا کہوں؟ اگر تمہیں صرف کاروباری سیکریٹری کی ضرورت ہوتی تو میں بخوشی اپنی خدمات پیش کر دیتی، مگر مجھے تمہاری نیت پر بھروسہ نہیں۔"

"مگر میری بڑی کو مجھ پر پورا بھروسہ ہے۔" وہ اپنی رو میں بہہ کر بولنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے کہ میرے علاوہ وہ اور بھی دو چار اشخاص میں گہری دلچسپی رکھتی ہے...... ایک تو تمہارا جیکل ہی ہے...... پھر بھی مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں......"

کمو کو اپنے بندھے ہوئے بالوں سے دباؤ سا محسوس ہونے لگا اور اُس نے کلپ نکال کر ایک خفیف سے جھٹکے سے اِنہیں گود میں پھیلا لیا، جس پر ہٹ مین سحر زدہ سا ہو کر لحہ بھر تھم گیا...... میں اِس یکسر اجنبی لڑکی سے دو ایک روز میں ہی کتنا مانوس ہو گیا ہوں، مانو ہم نے

ایک پوری عمر باہم گزاری ہو اور ہمارا جی نہ بھرا ہو اور ایک اور عمر کا آغاز کرنے کے لئے ہماری مڈ بھیڑ ہو گئی ہو...... کیا یہ ممکن ہے کہ...... وہ اُس سے شادی کے خیال پر اپنا مذاق اڑانے لگا۔

"تم کیا بتا رہے تھے؟"

"بتانا کیا ہے؟ تم نے اپنے جادو کے زور سے مجھے گھوڑا بنا دیا ہے، اِس لئے ہنہنائے جا رہا ہوں۔"

"تو پھر ہنہناتے جاؤ۔"

"میں ایک مرض میں مبتلا ہوں کمو سارا دن آنکھیں کھولے رکھنے کے بعد جب میں سو جاتا ہوں تو میری آنکھیں بدستور کھلی رہتی ہیں، اور یقین کرو، اگر کوئی اُنہیں بند نہ کرے تو میں سوتے سوتے بھی ویسے ہی دیکھتا رہتا ہوں اور میرا یہ کام، میری آنکھوں کو نہایت آہستگی اور نرمی سے بند کرنے کا فریضہ بڑی نے اپنے ذمے لے رکھا ہے......"

پوئر بوائے! کمو کو احساس نہ تھا کہ جو شخص بظاہر اتنا چارہ کار ہو وہ دراصل اتنا لاچار ہے، مگر اپنی ایک سوچ پر اچھل کر وہ بولی۔ "سونے سے پہلے تم آنکھوں پر پٹی کیوں نہیں باندھ لیا کرتے؟"

وہ پل بھر ٹھٹکا اور پھر مسرت سے بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا اور پھر بیٹھ کر گویا ہوا۔ "ارے ہاں؟ یہ طریقہ تو ڈاکٹر کو بھی نہ سوجھا۔ اُس نے نہایت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا......

"تھینک یو، مس لالہ...... آئی مین، مائی ویری ڈیئر کمو، تھینک یو ان ڈیڈ!"

"مگر رات کو آنکھوں پر پٹی باندھنے سے بھی ضروری ہے کہ دن کو ذہن پر پٹی باندھے رکھو اور الم غلم مت سوچا کرو۔" کمو نے اُس کے ہاتھ کی پشت کو اپنے دوسرے ہاتھ سے تھپتھپایا۔ "اگر میں تمہاری ماں ہوتی تو اپنے سارے کام چھوڑ کر تمہیں سکھا دیتی کہ ذہن پر پٹی باندھ لیں تو آنکھوں میں کیونکر باغات اُگ آتے ہیں......"

اتنے بڑے ہٹ مین کو اپنی یہ چھوٹی سی ماں شاید اپنی محبوب لگی، یا بیوی، یا ماں ہی، اور اُس کے خشک گال پر کھڑکی سے بادل کی ایک بوند آ گری، یا ممکن ہے، اُس کی آنکھ سے ہی۔

"مجھے تو اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہیں۔"

"کیا تمہاری ماں بچپن میں ہی اٹھ گئی تھی؟"

"نہیں، کاروبار میں اُس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"سوچا کرو، وتی۔ گاڈ کی طرح مدر کی بھی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ بس اُس کا خیال ہوتا ہے۔"

ہٹ مین کو معلوم ہوا کہ اگر اُس نے فوراً وہسکی نہ پی تو جہاز میں اڑنے کی بجائے وہ خود آپ ہی اڑنا شروع ہو جائیگا...... سٹیورڈ، اے ویری لارج وہسکی!...... آن دا راکس!"

"میرے لئے بھی!"

کنواری ماں کی مسکان سے ہٹ مین کے بدن میں اجالا ہونے لگا۔ وہ ڈرنے لگا، کیا واقعی مجھ پر کوئی جادو تو اثر نہیں کر رہا ہے؟

اِسی دم کمو نے پتہ نہیں کیا سوچ کر پوچھ لیا۔ "کیا تم جادو میں یقین رکھتے ہو وتی؟"

"نہیں، کیوں؟"

"اگر رکھتے ہو تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"نو کمو، فار گاڈز سیک، نو! میں صرف اسٹاک ایکسچینج ٹیکنالوجی میں یقین رکھتا ہوں۔ اگر ہم امریکی بھی جادو پر بھروسہ کرنے لگیں تو تمہارے ملک کو فارن ایڈ کون دے گا؟......"

(٦)

دو ڈھائی بجے سہ پہر تک کمو اور ہٹ مین ایلورہ کے غار دیکھ کر اورنگ آباد کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں بھی آپہنچے، جس کے پروپرائٹر نے ہٹ مین اینڈ لالہ فنانس (انڈیا) سے اپنے ہوٹل کی توسیع کے لئے حال ہی میں ایک موٹا قرضہ لیا تھا۔ اُن کا پروفیسر نما ٹورسٹ گائیڈ ابھی تک اُن کے ساتھ تھا اور حالانکہ وہ اُس سے کچھ بھی نہ پوچھنا چاہتے تھے، پھر بھی وہ منہ سے جھاگ چھوڑ چھوڑ کر انہیں غاروں کی مزید تفصیلات بہم پہنچانے کے لئے بولے جا رہا تھا۔ ہٹ مین کو بے چارے پر ترس آنے لگا اور جب وہ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر شاید ٹائلٹ گیا تو ہٹ مین نے اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ مل کر کمّو سے کہا۔ "بہت بور کر رہا ہے۔ اُسے اتنا بڑا ٹپ دو کہ اُس کی زبان گنگ ہو جائے اور چلتا بنے۔" بور ہو ہو کر اُس کی بھوک خوب چمک اٹھی تھی۔ "یہاں بھی تم نے ویجی ٹیرین فوڈ کے لئے تو نہیں کہہ رکھا؟"

"نہیں، دلّی، یہاں تو چاہو تو مجھے بھی کچا کھالو۔"

اِسی دوران جب بڈھا گائیڈ لوٹ آیا تو اُس کا منہ کھلنے سے پہلے کمو نے پرس سے سو سو

کے دس نوٹ نکال کر اُسے تھما دیئے، جنہیں جھپٹ کر وہ اُن کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا اور چپ چاپ واپس ہولیا۔

"اِس آدمی نے تمہارے دیوی دیوتاؤں کے اتنے قصے سنائے ہیں۔" ہٹ مین ہنس ہنس کر، کمو سے مخاطب ہوا۔ "کہ لگتا ہے اُنہیں بھی میری طرح سوتے جاگتے کچھ نہ کچھ پیش آتا رہتا تھا۔ اُس وقت کوئی ڈاکٹر واکٹر تو تھے نہیں۔ یہ دیوی دیوتا آنکھوں پر پٹی باندھ کر سو جاتے ہوں گے۔"

"نہیں، وتی، اگر دیوی دیوتا بھی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے تو سنسار کیسے چلتا؟"

"مگر اگر وہ پٹی نہ باندھتے کمو، تو وہ خود آپ کیسے چلتے؟" وہ بڑا خوش نظر آنے لگا۔ "تم نے ایک ملین ڈالر کا بھاؤ دیا ہے کہ میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر سویا کروں۔ یہ بڑی بھی فراڈ ہے۔ صرف اتنے سے کام پر ہی میرے دل پر حکومت کرتی رہی۔"

اتنے میں ایک بیرا بیئر کی بوتلیں لے آیا اور اُن کے آگے رکھے ہوئے گلاسوں میں بیئر انڈیلنے لگا۔ ہٹ مین نے گلاس کو منہ سے لگانے سے پیشتر بیئر کی بوتل کا لیبل دیکھ کر تسلی کر لی کہ امریکی یا کم سے کم یورپی ہے۔

"مگر میں تو یہیں کی ہوں۔"

"تم تو مشرق کا سب سے قیمتی کچا مال ہو، جسے اپنے استعمال کی کوئی شکل دے کر ہم دگنے چوگنے داموں پر فروخت کریں گے۔"

کمو کو واقعی برا لگا۔ "تو کیا تم مجھے بیچ دینا چاہتے ہو؟"

ہٹ مین کی سمجھ میں نہ آیا کہ اُس نے برا کیا کہا ہے۔ "میرا مطلب ہے، وہی شئے یا شخص قیمتی ہوتا ہے جس کے مارکیٹ میں دسوں خریدار ہوں......"

وہی بوڑھا ٹورسٹ گائیڈ اچانک لوٹ آیا۔ "سر، میں اپنا کارڈ دینا بھول گیا تھا۔" کارڈ لے کر ہٹ مین نے اُسے جلدی سے ڈسمس کیا اور اُس کی پشت دیکھتے ہوئے کمو کو بتانے لگا۔ "اب اسی بور کو لے لو۔ اِس جیسے دسوں ہیں، مگر کوئی خریدار بھی تو ہو۔ سو پچیس پچاس ڈالر ملنے پر ہی خوشی سے حواس کھو بیٹھتا ہے...... پر کچھ بھی کہہ لو۔" یکبارگی، کچھ یاد آجانے پر اُس نے قہقہہ لگایا۔ "اُس کی ایک کہانی مجھے بہت دلچسپ لگی۔ میں اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں، اگر دلچسپ بننا ہے تو ناقابلِ یقین سناؤ، بلکہ ناقابلِ یقین ہو جاؤ، مثلاً میری یہی بات

لے لو کہ سوتے میں میری آنکھیں بند نہ کی جائیں تو مجھ سب کچھ ہو بہو نظر آتا ہے......"

"تو کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں، کوئی یقین نہیں کرتا، اس لئے نہایت دلچسپی سے سنتا ہے، مگر میں تمہیں گائیڈ کی وہ کہانی سنانے جارہا تھا...... ٹھہرو، پہلے پیاس بجھالوں۔" وہ بیئر کو پانی کی طرح غٹ غٹ چڑھا گیا۔ "ہاں، تو کیا ہوا کہ ایک غار میں دیوی دیوتاؤں کو ناچتے ہوئے دیکھ کر مجھے لگا، وہ سچ مچ ناچ رہے ہیں۔ گائیڈ بھی مجھے یقین دلانے لگا، سر، وہ پتھر کے نہیں زندہ ہیں اور واقعی ناچ رہے ہیں...... اُس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا، پہلے پہل یہاں کوئی دیوار نہ تھی، کھلی جگہ تھی۔ کیا ہوا کہ بعض دیوی دیوتا ایک دن ناچتے ناچتے اِسی راستے باہر نکل گئے اور اِسی پہاڑ کے نیچے جنگل میں جا بسے...... میں گائیڈ کی بات کا مذاق اڑانے لگا کمو، مگر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے غار سے باہر لے آیا اور بولا، وہ دیکھئے سر، وہ جھوٹا سا گاؤں ہے نا؟ وہاں اُنہی دیوی دیوتاؤں کی اولاد آج تک بسی ہوئی ہے...... میں نے دوربین سے وہاں نیم برہنہ جنگلی لوگوں کو دیکھا اور میری تسلی ہو گئی...... ہہ ہاہہ ہہ......!"

"مذاق مت اڑاؤ، وتّی۔ اِن مورتیوں میں کلاکاروں نے اپنی سانس بھر دی تھی۔"

"ہاں، کمو، کسی دیوی یا دیوتا کے قدموں پر ایک نہایت اداس داسی دیکھ کر میں بھی چونک گیا تھا۔ دیوی دیوتا تو مجھے مٹی کے مٹی لگے، مگر یہ داسی بناتے ہوئے آرٹسٹ ضرور اپنی محبوبہ کے ہجر میں تڑپ رہا ہوگا اور یوں اُس نے اُسے ...... جیسے کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے...... جوں کا توں اپنے سامنے کھڑا کر لیا......"

کمو اُس کا خالی گلاس بیئر سے بھرنے لگی۔ "اگرچہ تمہارا ذہن ہمیشہ فنانس کے مسائل میں الجھا رہتا ہے، مگر ہے بہت زرخیز......"

"تو پھر کھیتی باڑی کیوں نہیں شروع کر دیتیں؟"

"مذاق چھوڑو، وتّی تمہارا وہ سوال بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا جو تم نے ایلورہ کی پہاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا تھا۔"

"کونسا؟" بیرے کو کھانا لگاتے ہوئے دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر کچھ اٹھا لے۔

"ایک چھوٹی سی بستی کی طرف اشارہ کر کے تم نے پوچھا تھا، کیا وہاں بھی کھدائی

ہو رہی ہے اور......"

"اور؟"

"اور وہ لوگ صدیوں بعد نیچے سے ویسے کے ویسے سانس لیتے ہوئے بر آمد ہو گئے ہیں؟"

"ہہ ہاہہ......!" ہٹ مین جانے میز پر کھانا لگتے دیکھ کر زیادہ خوش ہو رہا تھا، یا کمو سے اپنا سوال سن کر۔

(۷)

کمو اور ہٹ مین کا ہوائی جہاز غاروں کی سطح سے بہت اوپر خلاؤں میں دلّی کا رُخ کئے ہوئے تھا اور وہ ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے تھے، یا شاید ہنسنے کی کوئی بات نہ ہو، بس اُن کا جی چاہ رہا ہو کہ ہنسیں۔

"تم کچھ بھی کہہ لو۔" کمو کو اچانک ہٹ مین کے جسم کی حرارت اپنے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ ذرا پرے سرک گئی۔ "میں تمہارے بے ماضی پن کو تمہاری بد قسمتی سے ہی تعبیر کروں گی۔"

"نہیں، کمو، ہم مستقبل کو صیغہ ماضی میں نہیں جی سکتے۔" جیب سے چیونگ گم نکال کر اُس نے اپنے منہ میں ڈال لیا۔ "یا پھر یہ ہے کہ ہم لوگ زمین دوز غاروں میں کھد کر پڑے رہیں۔"

"ہمارے بچے تمہارے چیونگ گم بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"

کمو خود کو روک نہ سکی۔ "شاید اِس لئے، کہ خالی منہ ہلا ہلا کر تمہارے مانند اناپ شناپ باتوں کی خواہش پوری کر لیں۔"

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کمو، کہ آگے جا کر ہم آگے آ پہنچتے ہیں؟ سو سمپل! ہمیں اپنے زمان و مکان میں جئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ مشرقی لوگ اِسی لئے حادثوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں کہ پیچھے کی طرف منہ کر کے آگے چلتے ہیں۔" وہ پھر اُس کی طرف سرک آیا۔ "جنیا کوئی شعبدہ بازی نہیں کمو ڈیئر۔ زندگی کے کاروبار میں...... میرا مطلب ہے، محبت کے کاروبار میں بھی ہمیں آگے ہی آگے جانا ہوتا ہے اور اِس عمل میں آدمی آدمی کا اتنی دور تک ہی ساتھ دیتا ہے جہاں تک اُس کی سہولت یا غرض ہو، یا اِس سے بھی زیادہ...... جہاں

تک اُس میں دم ہو۔" کمو کی طرف انچ انچ سرکتے ہوئے وہ اُس سے جڑ کر بیٹھ گیا۔ "اِس مانند کیا ہوتا ہے کہ سبھی سبھوں کا ساتھ چھوڑتے چلے جاتے ہیں......"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"یہ، کمو، کہ جو جب مل جائے، صرف اُسی سے ملو۔" اُس نے چیونگ گم کو پھیکا ہوتے ہوئے پاکر ایک اور منہ میں ڈال لیا۔

"مگر جو بچھڑ جائے وہ ذہن میں تو موجود رہتا ہے۔" کمو بات چیت میں پورے طور پر شامل ہو چکی تھی۔ "اُس سے وہیں کیوں نہ ملیں؟"

"کیونکہ ہم اُسے وہاں چھو نہیں سکتے۔" اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "گلے نہیں لگا سکتے......"

"کسی سے بالمشافہ مل کر بھی ہم اُسے اِسی لئے گلے لگاتے ہیں کہ اُس سے پہلے بھی مل چکے ہوتے ہیں...... ذرا غور کرو وتی یادداشت کے بغیر انسانی رشتوں میں بھونچال آجائے گا۔"

"مگر کمو ڈارلنگ، میں تو اِس لئے تمہیں گلے لگانا چاہتا ہوں کہ یادداشت کھو چکا ہوں۔" اُس نے اپنا بازو اُس کی کمر میں حمائل کر لیا۔

"نو، وتی۔" وہ یکایک موضوع سے نکل کر اپنے آپ میں لوٹ آئی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر تم نے تو رائے دی تھی کہ دماغ پر پٹی باندھ لیا کرو۔" ہٹ مین نے اپنا دوسرا بازو بھی اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"نو، پلیز، نو!...... صرف دوستی!"

"لیکن صرف دوستی میں پہلے ہی دو دن بیت چکے ہیں۔" کمو کے وجود کو اپنے بازوؤں میں باندھ کر وہ اُس پر جھکتے جا رہا تھا۔ "اور دو دن بعد میں یہاں کہاں ہوں گا۔" اُس نے اُس کے منہ میں اپنا منہ ٹھونس دیا۔

وہ پوری قوت سے اپنے آپ کو چھڑا کر ایک الگ سیٹ پر جا بیٹھی۔

"نو، مسٹر ہٹ مین!"

"آئی ایم ساری، مس لالہ!"

چکورولا آج اِس طرح آراستہ پیراستہ کھڑا تھا، جیسے لالہ سادھورام خود آپ، اپنی پگڑی اتار کر۔

ولاؔ کے سب سے بڑے کانفرنس روم میں اِس وقت ہٹ مین اینڈ لالہ فنانس (انڈیا) کی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سالانہ میٹنگ چل رہی تھی۔

ہٹ مین کی گل پوشی وغیرہ کے بعد کمپنی کے چیئر مین لالہ سادھورام نے اپنی طویل رپورٹ پڑھی جس میں واضح طور پر ذکر کیا کہ اگرچہ ہماری قومی اکانومی سے کافی غیر ضروری ضوابط اٹھائے جاچکے ہیں، تاہم جوابھی باقی ہیں اُن کے باعث بھی اکانومی کی آزاد نشوونما میں بہت رکاوٹیں در پیش ہیں، جنھیں فوری طور پر ہٹالیناعین دانش مندی ہوگی۔

لالہ سادھورام کی رپورٹ کے بعد تھوڑی دیر رپورٹ میں پیش کردہ مسائل پر گرما گرم بحث ہوئی اور بالآخر اِسے متفقہ طور پر قبول کر کے میٹنگ کے اراکین نے ایک ریزولیوشن کے ذریعے ہٹ مین اینڈ لالہ فنانس (انڈیا) کی کارگزاری کو ہر لحاظ سے قابل ستائش قرار دیا۔

آخر میں چیئر مین ولیم ہٹ مین اپنی تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو کانفرنس روم تالیوں سے گونج اٹھا۔ میٹنگ کا ہر رکن بڑی بے تابی سے چیئر مین کے اعلان کا منتظر تھا کہ کمپنی کی نہایت اعلیٰ کارگزاری کے پیش نظر اس نے کمپنی میں اپنی ذاتی سرمایہ کاری کو دگنا کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔

چیئر مین ولیم ہٹ مین نے اپنی تقریر کو بڑے خوش باش لہجے میں چند جملوں میں ہی سمیٹ دیا، جنھیں سن کر کو چیئر مین لالہ سادھورام اور دوسرے ڈائریکٹروں کے چہرے اتر گئے۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین، میں تو اپنے نمائندہ خاص کی سفارش پر امریکہ سے آیا ہی اِس اعلان کی نیت سے تھا کہ اپنی ان وسیٹمنٹ کو فی الفور دگنا کردوں، مگر ہمارے کو چیئر مین مسٹر لالہ نے جس معتبر انداز سے اپنی رپورٹ میں بعض اڑچنوں کا ذکر کیا ہے، اُس کے پیش نظر میری رائے میں ابھی سرمائے کے اس قدر پھیلاؤ کا ٹائم نہیں آیا، لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے جب تک اِس ملک کی اکانومی میں لبرلائزیشن کا فطری عمل سرکاری طور پر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا مجھے اُس وقت تک توسیعی سرمایہ کاری کو معرض التوامیں ڈالے رکھنا چاہیے۔

اٹھارہ ادھیائے

پہلا ادھیائے

پنڈت جی نے گیتا کا شلوک لہرا لہرا کر گاتے ہوئے پورا کیا اور پھر ذرا رک کر اس کا ارتھ[1] بیان کرنے کے لئے گائیکی سے گدیہ[2] کی طرف آگئے:

"بھگوان کرشن نے ارجن کا دھیرج بندھاتے ہوئے کہا۔ اے ارجن، جب جب پاپ کا گھڑا ابھر جاتا ہے، تب تب میں سنسار میں پرویش[3] کے لئے جنم لیتا ہوں۔"

"مگر پنڈت جی۔۔"

پنڈت جی کو بولتے ہوئے ٹک جانا کھلا، مگر یہ سوچ کر کہ پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں کوئی بات مشکل سے ہی آپاتی ہے، وہ اپنا ویاکھیان روک کر ٹوکنے والے کی اور دیکھنے لگے۔

"بولو، بندھو!"

"میں پوچھنا چاہتا ہوں پنڈت جی، گھڑے میں کوئی جگہ بچی رہ گئی ہے جو کرشن بھگوان نے ابھی تک جنم نہیں لیا؟"

اسے کوئی سیدھا جواب دینے کی بجائے پنڈت جی سنسکرت کا ایک اور شلوک الاپنے لگے، جس پر پربھو پریمیوں کو سر دھنتے پا کر سوال کرنے والے نے بدک کر چپ سادھ لی اور پنڈت جی اپنی کتھا آگے بڑھانے کے لئے پستک کے اگلے پنے پر آنکھیں دوڑانے لگے۔

دوسرا ادھیائے

کرشن بھگوان بے چارہ کیا کرتا؟ وہ تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ایک نیک جننی کی کوکھ

---

[1] نثر [2] داخلہ [3] تقریر

میں آگا تھا، مگر اسی دوران جنتی کے پتی نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک سروس میں اس کی ترقی کا طے نہیں ہو جاتا، وہ اپنے بچے کی پرورش نہیں کر سکے گا، اس لئے اس نے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کرشن کنہیا کو اپنی پتنی کی کوکھ میں ہی ضائع کروا دیا۔

مگر بھگوان کو تو پیدا ہونا ہی تھا۔ اس نے اسی گھر میں اس کی کنواری بہن کی کوکھ میں جا پناہ لی، جو اپنے دفتر کے ایک بابو کے پریم جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ بابو کو جب پتہ چلا کہ اس کی پریمیکا پیٹ سے ہو گئی ہے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟" پریمیکا کہنے لگی۔ "آؤ، جھٹ پٹ بیاہ کر لیتے ہیں۔"

"مگر میں تو اپنے چچیرے بھائی کے پاس رہتا ہوں۔" اس نے ہتھیلیاں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "بیاہ کر کے رہیں گے کہاں؟"

"ساری دنیا جو ہے۔"

"مگر۔" مگر اچانک اپنی سوچ پر وہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ "آج ہی کوئی گولی وولی کھالو۔ جھنجھٹ ختم!"

ادھر کرشن بھگوان نے بھی پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ جیسے بھی ہو، پیدا تو اسے ہونا ہی ہے۔ اب کے اس نے دیش کے ایک ادھیڑ عمر راجیہ منتری کا گھر ڈھونڈ نکالا۔ منتری کے کوئی اولاد نہ تھی اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل بھی نہ رہا تھا، مگر منتری کی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو، منترانی کی کوکھ بھر جائے، سو جب بھی وہ اپنے نئے پرائیویٹ سکریٹری کو منترانی کے بیڈ روم سے دبے پاؤں نکلتے دیکھ لیتا، منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ قصہ مختصر آخر منترانی کے حمل ٹھہر گیا اور اس طرح وقت آنے پر جنم اشٹمی کے شبھ موقع پر کرشن بھگوان نے سنسار میں پرویش کیا۔

تیسرا ادھیائے

گھٹنا بالکل ویسے ہی گھٹی، جیسے دواپر یگ میں پہلی بار۔ بھگوان نے ایک بار اپنے بالک روپ میں یہ دکھانے کے لئے اپنی منترانی میا کے سامنے منہ کھولا کہ وہ مٹی نہیں کھا رہا ہے۔

منترانی میا کو بالک کے منہ میں ساری سرشٹی[1] دِکھ آئی اور اسے پورا وشواس ہو گیا کہ اس کا سپتر بھگوان کا اوتار ہے۔ میا نے ممتا سے بیکل ہو کر اپنے کرشن گوپال کو باہوں میں سمیٹ لینا چاہا مگر بھگوان ایک اسی کی بانہوں میں سمٹ آتا تو سرشٹی کا اُپکار کیسے ہو پاتا؟ وہ دیکھتی رہ گئی اور ننھا منا کرشن گوپال اس کی بانہوں سے پھسل کر اپنی مدھر ہنسی کی گھنٹیاں بجاتے ہوئے یہ جا وہ جا!

کرشن گوپال پیدا تو ہو لیا، پرنتو جب تک ننھا منا بالک بڑا نہ ہو جاتا، وہ پر تھوی کا اُدّھار کیسے کر پاتا؟ بھگوان کو بھی اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے نیم کے انوسار ماس ماس اور ورش ورش بڑا ہو۔ پاپ کا گھڑا؟ بھگوان بڑا ہوتا رہا اور پاپ مایا روپی جادوئی گھڑے سے چھلک چھلک کر بستیوں میں چاروں اور ندیوں نالوں کی طرح بہہ نکلا۔ لوگ......؟ لوگ باگ کیا کر سکتے تھے، سوائے اس کے کہ میلی ندیوں میں ہی نہا نہا کر اپنے اجلے پن کا بھرم بنائے رکھیں۔ دور کیوں جائیں، کرشن گوپال کے پتا مہودیہ منتری، شری بھاگیہ وان جی کا دیش بھر میں بڑا نام تھا۔ لوگ ان کی نیک نامی کی قسمیں کھایا کرتے تھے، اور وہ اپنے آپ کو سہج بدھی کی آڑ میں سمجھایا کرتے تھے، بھاگیہ وان، ساری نیک نامی کس سے ہے؟ نام ہی سے نا؟ اس لئے بھاگیہ وان، نیک بنو یا نہ بنو، نام بنائے رکھو، اور نام بنائے رکھنے کے لئے کیا چاہیے؟ پیسہ! نہیں، بھاگیہ وان، پیسے کے بغیر تم بھی کس کام کے؟ پیسہ ہو گا تو غریب جنتا کی مدد بھی کر پاؤ گے؟ نہیں، بھاگیہ وان، جنتا کو کھا کھا کے رجھتے رہو اور رجھ رجھ کے جنتا کی بھوک مٹانے کا اپائے کرو۔ اور...... اور یہ بھی تو ہے کچھ کرو گے نہیں تو تمہارے اکلوتے کرشن گوپال کا کیا بنے گا؟ زمانہ اتنا برا ہے۔ اپنے کرشن گوپال کو کیا بھوکوں مارو گے؟

سو بھگوان کرشن کی پال پوس، سِکشا اور سُرکشت جیون کے لئے منتری مہودیہ نے اپنے بیٹے کے نام دنیا بھر کے بنکوں میں اتنی راشی جمع کر لی کہ بھگوان بار بار جنم لے کر بھی اسے کھاتا اڑاتا رہتا تو راشی ختم نہ ہوتی۔

چوتھا ادھیائے

منتری مہودیہ شری بھاگیہ وان نے کرشن گوپال کو پرائمری اسکول تک تو اپنے ساتھ

---

1. کائنات 2. بھلا 3. زمین 4. تعلیم 5. محفوظ

ہی رکھا اور آگے کی تعلیم کے لئے اسے امریکہ بھیج دیا۔ ان دنوں منتری مہودیہ خود آپ ایجوکیشن کا پورٹ فولیو سنبھالے ہوئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ہماری سکشا یوجناؤں کو منترالیہ سے باہر پاٹھ شالاؤں کے راستے بجھائی دینے میں نہیں آرہے۔ دوسرے، ان کا وچار تھا کہ اپنی شدھ بھاشا کس کام کی، نہرو اور جناح جیسے مہاپرشوں کے سامنے اسی لئے تو کوئی دم نہیں مار سکتا تھا کہ وہ انگریزوں سے بھی کڑک انگریزی بول لیتے تھے۔ ہمارا کرشن گوپال بھی اگر بالک اوستھا میں وہاں جا پہنچا تو واپسی پر اچھے اچھوں کو لوہے کے چنے چبوائے گا۔ منتری مہودیہ سوچنے لگے کہ اس محاورے کو انگریزی میں کیسے کہا جاسکتا ہے، اور کچھ سمجھ نہ آنے پر وہ مایوسی سے سر ہلا ہلا کر خوش ہونے لگے کہ میرے کرشن گوپال کو کم سے کم اس کٹھنائی کا سامنا تو نہ ہوگا۔

کرشن گوپال اپنی اس بالی عمر میں ودیش پہنچ کر شروع شروع میں تو بہت رویا دھویا۔ امریکیوں کو کیا پتہ، کہ بالک روپی بھگوان اپنی لیلا رچائے ہوئے ہے۔ وہ اسے سدھارن بالک سمجھ کر اس کا دل لگانے کا پورا پربندھ کرتے رہے اور ہوتے ہوتے کرشن گوپال کا دل وہاں اتنا لگ گیا کہ معلوم ہوتا تھا، پیدا ہی وہیں کہیں ہوا ہے۔ کہاں؟ کیا پتہ، کہاں؟...... اس کے ماں باپ کون تھے؟...... کیا پتہ، کون؟...... امریکیوں میں ہیومن رائٹس کی جو لہر اٹھی ہوئی ہے، اس کے مطابق ماں باپ اپنی جگہ، اور ان کی نابالغ سنتان اپنی جگہ۔ سنتان کا یہ ادھیکار بنا رہنا چاہیے کہ انہیں صرف انہی کے ناموں سے جانا جائے۔ ان کی اپنی پہچان سے ان کے ماتا پتا کا کیا سمبندھ۔

کرشن گوپال بھی جب وہاں کئی برس کے نواس کے بعد اپنی قانون کی ڈگری حاصل کرنے میں سپھل ہو گیا تو ماتا اور پتا اس کے لئے بس دو شبد تھے جنہیں وہ پستکوں یا اپنے ماں باپ کے خطوں میں پڑھ لیتا تھا۔ ان شبدوں سے اس کے دل میں کوئی چتر نہ کھنچ پاتا تھا۔

نہیں، ان سارے سالوں میں امریکہ میں منش کی کایا میں اونچا ہو ہو کر کرشن گوپال کے دل و دماغ سے اڑ ہی چکا تھا کہ وہ ساکشات کرشن بھگوان ہے، یا پھر دوسرے امریکیوں کی طرح اسے بھی لگتا ہوگا کہ وہ کسی بھگوان سے کیا کم ہے۔ شروع میں؟ شروع شروع میں تو اسے سب کچھ یاد ہوگا، مگر اُنہی دنوں اس کے امریکی ٹیچر کو جب کھٹکا سا ہوا کہ سانپ سپیروں کے دیش کا یہ لڑکا اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے تو پہلے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا مگر پھر سنجیدہ ہو کر

کئی مہینے اس کے چت میں ڈیوائن رائٹس کے ناش کے آپریشن میں جٹا رہا۔

کرشن گوپال نے اپنے ہائی اسکول کے آخری دنوں میں ایک زوردار عشق کیا اور اس میں ناکام ہو کر جب خودکشی پر اتر آیا تو یہاں بھی اس کے ٹیچر نے بڑی مشکل سے اسے پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ اس کے بعد کالج کے دنوں میں کرشن گوپال نے ایک امریکی لڑکی سے عشق کر کے خود آپ ہی اسے چھوڑ دیا اور چونکہ اس بے چاری کو خودکشی سے بچانے والا کوئی نہ تھا اس لئے اس نے نراش ہو کر جان دے دی۔ اپنا آخری عشق کرشن گوپال نے لاء کی ڈگری لینے کے بعد کیا اور اپنی ہندوستان کو واپسی اس وقت تک رد کے رکھی جب تک کیتھی سے باقاعدہ شادی نہ کر لی۔

کیتھی بڑی بے دھڑک طبیعت کی مالک تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو بتایا، تم کیا اور کوئی اور کیا، میں نے تم سے صرف اس لئے شادی کی ہے کہ کسی طرح ہندوستان دیکھ لوں۔

"کیوں، ہندوستان میں ایسا کیا ہے؟"

"میرا دادا وہاں برٹش آرمی میں کرنل تھا اور بچپن میں اتنی کہانیاں سنایا کرتا تھا کہ میرے کانوں میں ابھی تک ہندوستانی سپیروں کی بین بجتی رہتی ہے۔"

کرشن گوپال نے بھی کیتھی سے صرف کیتھی کے لئے شادی نہ کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ سارے امریکہ کو ہندوستان اٹھا لے جائے، کیتھی کے ساتھ اسے وہاں بھی لگے گا کہ وہ امریکہ میں ہی رہے جا رہا ہے۔

پانچواں ادھیائے

اندرا گاندھی ایئرپورٹ پر اپنے جہاز سے نکلتے ہوئے کرشن گوپال کے چنتن میں اپنے ماں باپ کا کوئی حلیہ نہیں ٹھہر پا رہا تھا۔

"او۔ ڈیم!" کیتھی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے سوچا کہ اس کے والدین کا فوٹو تو سوٹ کیس میں بند ہے۔

ریسپشن میں جب اس کے باپ کا وہی پرانا پرسنل سکریٹری...... اس کا باپ بے اختیار اس کی طرف بڑھ آیا تو کرشن گوپال نے اپنے لہجے میں نمائشی سا تپاک پیدا کر کے اس کی

طرف ہاتھ بڑھادیا۔

"ہاؤڈُو یوڈُو، ڈیڈ؟"

منتری مہودیہ نے آگے آکر اس کے باپ کو پرے دھکیل دیا اور اسے بتانے لگے۔

"تمہارا ڈیڈ میں ہوں بیٹے۔"

اس نے اپنا ہاتھ فوراً اس کی طرف بڑھادیا۔ "آئی ایم ساری، ڈیڈ۔"

گھر پہنچنے پر تھوڑی دیر میں ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا وزیر باپ کروڑوں کے گھوٹالے کے الزام میں ایک عدالتی مقدمے میں پھنسا ہوا ہے اور اگر اسے پیشگی ضمانت نہ مل چکی ہوتی تو اب تک وہ حوالات میں بند ہوتا، اور کہ اس کی ماں ہائی بلڈ پریشر سے کسی اسپتال کے شدید احتیاط کے گوشے میں بے ہوش پڑی ہے۔

"آئی ایم ساری ڈیڈ۔"

"نہیں، بیٹے، کشٹ کی کوئی بات نہیں۔" باپ بیٹے کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "تم آگئے ہو تو مجھے کیا فکر؟ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے آنے پر سب کچھ کیوں کر ٹھیک ہو جائے گا، مگر اسی دوران کیتھی سے آنکھیں چار ہونے پر وہ سب کچھ بھول کر مسکرانے لگا۔

چھٹا ادھیائے

یشودھا میا دوسرے ہی روز اسپتال سے گھر لوٹ آئی اور اپنے بیٹے کرشن گوپال سے گلے ملتے ہوئے اسے اتنے زور سے بھینچا کہ کرشن گوپال کو اچنبھا ہونے لگا، بیمار بوڑھیا میں اتنی شکتی کہاں سے آگئی ہے۔ اس کا بلڈ پریشر کہیں پھر سے تو ایک دم اونچا نہیں چلا گیا۔

"آہستہ، مام!"

"آہستہ کیوں، گوپالا؟ مورے گھر میں تو بھگوان بھی لوٹ آیا اور بیٹا بھی۔"

"میں تو لوٹ آیا ہوں، مام۔" وہ اپنی ماں سے پوچھنے لگا۔ "مگر تمہارا بھگوان کہاں ہے؟"

مگر اس سے پہلے کہ میا اسے کوئی جواب دے پاتی، خوشی سے ہانپ ہانپ کر اس کا بلڈ

پریشر پھر اتنا اونچا چلا گیا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گئی اور اسے پھر اِن ٹینسو کیئر یونٹ میں بھیج دیا گیا۔

ساتویں ادھیائے سے سولہواں ادھیائے

وغیرہ وغیرہ۔

سترہواں ادھیائے

حالانکہ ڈاکٹروں نے یشودھا کو دوسری بار اس تنبیہ کے ساتھ اسپتال سے ڈسچارج کیا تھا کہ وہ اپنی بھاونائوں کو قابو میں رکھے گی مگر اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی وہ لبالب بھرے گلاس کی طرح چھلک چھلک جاتی۔

"ذرا میرے پاس آؤ، گوپالا۔"

اور گوپالا اس کے قریب جاتا تو میا باؤلی ہو کر اسے اپنے بازوؤں سے سینے پر باندھ لیتی۔

"اتنے سال میری نظروں سے اوجھل رہے ہو گوپالا۔ میری موت سے پہلے کم سے کم اتنے گھنٹے تو میرے ساتھ بتاؤ۔"

چند روز تو میا کی بہو کیتھی اپنے پتی سے ہلکی پھلکی شکایت میں بات ٹالتی رہی، مگر پھر اسے محسوس ہونے لگا کہ پانی سر سے اوپر اٹھ آیا ہے، اور وہ اپنے پتی کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"تمہاری ماں تمہاری بیوی ہے گوپالا، یا تمہاری بیوی؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، ہنی؟"

"پوچھنے کی ہی بات ہے ڈارلنگ۔" کیتھی کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ "اسی لئے پوچھ رہی ہوں۔"

"کیا پوچھ رہی ہو؟...... کہ پاگل اولڈ وومن مجھ پر قبضہ کیوں جمائے بیٹھی ہے؟"

کرشن گوپال اپنی بیوی کو آرام سے سمجھانا چاہتا تھا۔ "مجھے خود اس کا پاگل پن ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"تو پھر دوسری آنکھ سے بھاتا ہوگا گوپالا۔" کیتھی کے سر پر میا بھوت کی طرح چڑھ آئی تھی۔

"شیل آئی سپیک دا ٹرو تھ؟ تمہاری ماں اصل میں سیکچوئیل پرورٹ ہے اور تمہیں اپنے ہزبینڈ کی طرح برتنا چاہتی ہے۔"

"نان سنس!"

"تم کچھ بھی کہو، مگر میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو صرف میرے ساتھ رہو۔"

"ٹھیک ہے ہنی۔ یہ بات ہے تو چند دن ہم یہاں گھوم پھر لیتے ہیں، اس کے بعد واپس سٹیٹس چلے جائیں گے۔"

"ہاں، ان سارے دنوں ہم آگرہ، اجنٹا کیوز اور موہنجوداڑو دیکھیں گے۔ اور کیا نام ہے اس شہر کا۔ ہاں، میرے دادا کا میرٹھ بھی دیکھنے جائیں گے ......"

"شیور، ہنی!"

"میرٹھ میں صرف فوج، سانپ اور سپیرے ہی رہتے ہیں؟"

"ایسا کیسے، ہنی؟"

"مگر میرا دادا تو بتایا کرتا تھا کہ ......"

اسی اثناء میں کیتھی کو یشودھا میا دور سے اپنے گوپالا کی طرف بازو پھیلائے لپک کر آتی دکھائی دی۔ "چلو گوپالا، اٹھو، یہاں سے نکل جائیں۔ وہ آ رہی ہے۔" وہ اسے باہر لے جانے کے لئے اپنے آگے دھکیلنے لگی۔ "جیسے تمہیں دبوچ کر اپنی کوکھ میں ٹھونس لینا چاہتی ہو۔"

اٹھارواں ادھیائے

یشودھا میا کی آنکھوں میں آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے اور منتری مہودیہ بھاگیہ وان اتنے گمبھیر اس وقت بھی نہ دکھے تھے جب عدالت نے انہیں کروڑوں کے گھوٹالے کا ملزم ٹھہرایا تھا۔

کل کرشن گوپال اور کیتھی واپس سٹیٹس جارہے تھے اور آج شام کو منتری مہودیہ نے اپنے یہاں گیتا کا پاٹھ ستھاپن کررکھا تھا اور وشیش[1] جتن کرکے ایک ایسا پنڈت ڈھونڈ نکالا تھا جو اس کے بیٹے اور بہو کے گیان دھیان کے لئے گیتا کے شلوکوں کا شدھ انگریزی میں انوواد[2] کرسکے۔ اس شبھ موقع پر اس نے اپنے بیسیوں متروں کو کنبے سمیت بلا رکھا تھا۔

ہے ارجن! وَین ایور داپاٹ برمز وِدھ سِن، آئی میک مائی اپیر نس اِن داوَرلڈ......

پنڈت کو بڑے دھیان سے سنتے ہوئے بھی گوپال کرشن کو یاد نہ آیا کہ خود اسی نے تو کوروکشیتر کے میدان میں ارجن کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی سے منہ ہٹا کر اپنی بیوی سے کہا۔ "اِنٹرسٹنگ، ہَنی، اَینٹ اِٹ؟ پھر وہ اچانک اپنی ایک سوچ پر ہنس پڑا۔ "یو نو، واٹ؟...... ان لوگوں میں سے ہر کوئی جنم سے پہلے خود آپ ہی کرشن بھگوان تھا اور جنم لے کر بھول گیا، وہ کیا تھا اور کیوں پیدا ہوا......"

---

[1] خاص [2] ترجمہ

مقامات

نیند میں آدمی کی موت واقع نہ ہو چکی ہو تو وہ پو پھٹنے کے آگے پیچھے جاگ ہی پڑتا ہے، بہت دیر سے سہی، جمال نے بھی آنکھ کھول لی ہے، اس کا خواب ٹوٹ گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی نظروں میں پیوند پیوند اڑ رہا ہے۔

امی!......امی...... ی!...... وہ ننھا سا ہے اور کھویا ہوا ہے اور رو رو کر اس کی گھگی بندھی ہوئی ہے...... امی!...... ہر طرف لوگ ہی لوگ ہیں۔ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا ہے اور اپنی ناک کی سیدھ میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ اور کھوتا جا رہا ہے۔ کسی نے بھی اسے روک کر نہیں پوچھا ہے۔ ''کہاں جا رہے ہو بالک۔؟'' مگر وہ بلک بلک کر بتا رہا ہے، امی! امی کے پاس!...... اور پھر ایک دم دو بانہوں نے کہیں سے کوند کر اسے لپیٹ لیا ہے اور اپنی امی کو دیکھے بغیر اسے پتہ چل گیا ہے کہ وہ امی ہی ہے اور...... امی کی پیشانی پر سے راستہ سیدھا ان کے گھر ہی کو جاتا ہے......

آؤ!......

جمال کے بچپن کے گالے پھر ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئے ہیں۔ سپنا پھر گھنا اور گہرا ہونے لگا ہے اور اس کی آنکھیں مند گئی ہیں۔

''پڑھو! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پڑھو، بسم اللہ......''

''بسم اللہ''

''الرحمٰن الرحیم''

''الرحمٰن''

''الرحیم''

''الرحیم''

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

"مولوی صاحب! لوگوں کے دس دس ہوتے ہیں، پر میرا تو ایک ہی ہے۔ میرے جمال کو جلدی سے قرآن حفظ کروا دیجئے۔ میں پورے دس کا نذرانہ پیش کروں گی۔"

"پڑھو جمال۔"

"پڑھ تو رہا ہوں مولوی صاحب۔"

"نہیں، دل سے پڑھو! خدا کے الفاظ کو دل سے پڑھو گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔"

جمال نے آنکھیں کھول لی ہیں اور کھلی آنکھوں سے بھی اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو اسے یقین آگیا ہے کہ وہ ابھی سویا ہوا ہے۔

"ابھی ابھی تو امی ہمارے ساتھ تھی خورشید۔ کہاں گئی؟"

جمال نے گھبرا کر اپنی بیوی سے پوچھا ہے۔

"امی!...... جاؤ خورشید۔ دیکھو، امی کہاں رہ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں موتیا اترا ہوا ہے خورشید۔ جاؤ، ہاتھ پکڑ کر لے آؤ۔"

"امی نظر نہ آئے تو دوسرے بھی آپ کو دکھائی نہیں دیتے۔"

"جاؤ خورشید! امی بے چاری کہیں ٹھوکر کھا کر گر پڑے گی۔"

"مجھ بے چاری کی طرف بھی آپ کیوں دھیان نہیں دیتے؟ جب سے شادی ہوئی ہے ٹھوکریں کھائے جا رہی ہوں۔"

"جاؤ خورشید!"

"آپ کی بیوی بننے سے تو اچھا تھا میں بھی آپ کی ماں ہی ہوتی۔"

"اچھا! تم یہیں ٹھہرو۔ میں خود۔"

"نہیں، میں گھر جا رہی ہوں۔"

"خورشید!"

"نہیں!"

نصف شب ہولی ہے اور ایک پاگل بوڑھیا جمال کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہی ہے۔

"نہیں، جمال بیٹے! دروازہ کھولو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ جمال۔ جما۔ل!!"

"سو جاؤ امی!"

"نہیں، بیٹے، دروازہ کھولو اور میرے پاس آؤ۔ میرے پاس آکر بیٹھو بیٹے۔"

"کھٹ کھٹ۔ ٹھ!"

جمال نے بڑی بے بس نظر سے بیوی کی طرف دیکھا ہے۔ "نیند کی ایک اور گولی دے آؤں خورشی۔؟"

"مارنا چاہتے ہیں تو دے آیئے۔ پہلی گولی دیئے ابھی پورا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔"

کھٹ۔ ٹ۔ ٹھ ٹھ۔ کھٹ!

"سو جاؤ امی! کل سویرے آفاق بیٹے کا اسکول کا امتحان ہے۔ خدا کے لئے سو جاؤ۔"

"چپ چاپ لیٹے رہیے۔ زیادہ توجہ دیں گے تو امی کا پاگل پن بڑھ جائے گا۔"

"میں پاگل نہیں ہوں بہو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے بھی اپنے پاس بٹھالو جمال بیٹے۔ میں دم سادھ کر بیٹھی رہوں گی۔ کھولو"

کھٹ۔ ٹھ۔

"اف فوہ! خدارا اپنی ماں کو پاگل خانے بھیج دیجئے، یا ہم سب کو۔ سنئے، آفاق بھی جاگ پڑا ہے۔ ابھی ابھی سویا تھا۔ اس کا امتحان۔"

"جمال!...... جمال۔ ل!" ...... کھٹ کھٹ۔ ٹھ!

جمال نے دیوانہ وار اٹھ کر دروازہ کھولا ہے اور ماں کو تیزی سے کھینچ کر چارپائی پر پٹخ دیا ہے۔ وہ چیخنے لگی ہے اور ...... اور جمال کے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہوئے اکڑنے لگے ہیں۔ اور وہ ایک دم سنبھل کر رک گیا ہے۔

"نہیں......!"

جمال اپنی مرحوم ماں کے خالی بیڈ روم میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں میں اپنی ماں کی صرف ناک، یا صرف ماتھا یا سر یا کوئی اور حصہ گھوم رہا ہے ...... اب ماں کی آنکھیں جھپک رہی ہیں۔ اب ہونٹ ہل رہے ہیں۔ اب ٹھوڑی ...... جمال اُس کے انگوں کو جوڑ جوڑ کر اس کی پوری شبیہ بنالینا چاہتا ہے۔ یہ ماتھا۔ اور یہاں یہ آنکھیں اور ...... لیکن ماتھا آنکھوں کی جگہ پر سرک آتا ہے ...... نہیں، اب وہ کبھی اپنی ماں کی صورت نہیں دیکھ پائے گا۔ اپنی ماں کی صورت اس کے دل و دماغ میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہے ...... نہیں!......

جمال کے خوابیدہ چہرے پر جنبش ہوئی ہے۔ جیسے کوئی مچھلی کانٹے میں اٹک کر تالاب کی ساکن سطح پر پھڑ پھڑائی ہو۔

"امی تو پاگل تھی خورشید۔ اسے کیا معلوم تھا، وہ کیا کر رہی تھی؟ اس کی کل کائنات ایک میں ہی تھا اور جب میں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تو باؤلی اور باؤلی کیوں نہ ہو جاتی؟...... تمہیں معلوم ہے خورشید اوپر اوپر سے تو میں اس کا علاج کروا رہا تھا لیکن جی ہی جی میں دعائیں مانگا کرتا تھا کہ خدا اسے اٹھا لے۔ ہاں خورشی، اور کیا؟ میں ہی اسے موت کی طرف دھکیلتا رہا ہوں۔ مگر بے ذہن ماں کو کبھی اپنے بیٹے پر شبہ نہ گزرا۔ ذہن ہوتا تو گزرتا۔ مگر مرنے سے چند گھڑیاں پہلے ...... تم نے دیکھا؟...... وہ ایسے ہو گئی جیسے کبھی پاگل تھی ہی نہیں...... اس نے باری باری ہم سب سے پیار کیا۔ میں سب سے آگے تھا لیکن مجھ سے وہ سب کے بعد ملی۔ جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے خورشی، اس سے بچھڑنا ہم پل پل ٹالتے ہیں۔ ہے نا؟۔ وہ مجھے کس کر بھینچ لینا چاہتی تھی لیکن ہڈیوں کے گچھے میں اپنی بانہیں اٹھانے کا بھی دم نہ رہا تھا۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن۔ لیکن۔"

بادل کے ٹکڑے آسمان میں یکجا ہو کر نیچے اترنے لگے ہیں اور اترتے ہوئے پانی پانی ہو کر بہہ نکلے ہیں اور جمال غوطے کھائے جانے کے باوجود ڈوب نہیں رہا ہے۔ وہ بھی بہتا جا رہا ہے اور ایک پل کے نیچے سے بہہ گیا ہے تو پھر وہی پل آ گیا ہے اور وہ پھر بہہ گیا ہے تو پھر وہی پل...... پھر وہی...... پھر...... اور اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس طلسمی عمل سے آزاد کرنا چاہا ہے۔

شاید وہ جاگ پڑا ہے؟۔ نہیں، ابھی نہیں۔

ایک بات سنو خورشید! سنو گی تو شاید ہنس دو گی...... امی کو مرے ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں؟ پانچ۔ نہیں، چھ۔ مگر مجھے لگتا ہے، امی مری نہیں، ہمیں یونہی وہم ہو گیا ہے وہ مر چکی ہے...... ذرا سوچو۔ ماں مر جائے، ہماری زمین ہی مر جائے تو ہم کیونکر اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکتے ہیں؟...... نہیں خورشی۔ ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ کون سی ماں چاہے گی کہ اس کے لہلہاتے پودے کھڑے کھڑے سوکھ جائیں؟ قدرت معصوموں کے ساتھ بے انصافی نہیں برتتی، ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ ہمیشہ!

"آئی آفاق!" بیٹے کی آواز سن کر ماں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اسی کی طرف بھاگی ہے۔

"لو بیٹے آگئی۔!" بس یہاں سے یہیں بھاگتے ہوئے آفاق کی ماں کو کئی سال بیت گئے ہیں۔

"بھئی خورشید! بیچ میں ذرا رک کے ہمیں بھی دیکھ لیا کرو۔" جمال اپنی بیوی کا راستہ روک لینا چاہتا ہے اور اس پر ٹکٹکی باندھ کر ٹھٹھک جاتا ہے...... وہی باؤلا سا چہرہ، دودھیلی ممتا میں ڈوبی ہوئی جھریاں، تشویش......

"اتنی رات ہو گئی ہے، آج پھر آفاق نہیں آیا۔ آفاق کے ابا سن رہے ہو؟ آفاق ابھی تک کیوں نہیں آیا......؟"

اور آفاق کا ابا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے...... خورشید!......

"جائیے، پتہ کیجیے، آفاق کے ابا!...... ٹھہریئے!۔ سنئے! نہیں، پہلے میری سنیے آفاق کے ابا۔ آج میں آفاق کے لیے چاند کا ٹکڑا دیکھ کے آئی ہوں۔"

"آؤ آفاق بیٹا۔ تم تو ہمارے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں بیٹھتے۔ سنو۔ میں تمہارے لئے دلہن دیکھ کے آئی ہوں"......

"نہیں۔ شادی میری ہے، آپ لوگوں کی نہیں۔ دراصل میں۔ سچائی یہ ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے چاہا تو میں اپنی بیوی کو یہاں لے آؤں گا، نہیں تو ہم دونوں الگ رہیں گے۔"

"الگ رہیں گے۔؟! آفاق کے ابا! سن رہے ہو۔؟ ہمارا بیٹا ہم سے الگ رہے گا۔ مجھے چکر آرہا ہے۔ مجھے تھام لو۔"

"آؤ بہو...... آؤ بیٹی! تم تو میرے لاڈلے کی دلہن ہو۔ میں تم دونوں سے الگ کیسے رہ سکتی ہوں؟۔ آؤ!......"

پھر وہی پل آگیا ہے اور جمال غوطے کھا کھا کے اس کے نیچے سے بہہ گیا ہے۔ پھر ویسے ہی بار بار وہی پل۔ جمال نے اتنے زور سے سر جھٹکا ہے گویا وہ جاگ پڑا ہو۔

مگر وہ بدستور تار تار سویا پڑا ہے۔

"دیکھئے امی! اپنے بیٹے کی طرف کم توجہ برتا کیجیے۔"

"کیا کہہ رہی ہو بہو۔؟!۔ میں نے تو اندھی باؤلی ہو کر اپنے آفاق کو اونچا کیا ہے۔"

"لیکن امی! اب تو میں اونچا ہو گیا ہوں نا!"

"لیکن مجھے تو اب بھی ویسے ہی منے سے لگتے ہو۔"

”میں اب منا سا نہیں رہا امی۔ آپ کے اس قدر پیار اور توجہ سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔“

بادل دھرتی کو سوکھا چھوڑ کر آسمان کی طرف اٹھنے لگے ہیں۔ برس جاؤ، خدا کے لیے برس جاؤ!

”آفاق کے ابا! آفاق کے......“

”ہاں بھائی خورشی، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

”بہو نے میکے سے کہلوا بھیجا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہے گی۔ جب تک آفاق کوئی الگ بندوبست نہیں کر لیتا وہ میکے سے نہیں لوٹے گی...... اب کیا ہوگا آفاق کے ابا...... یہ کیا ہو رہا ہے خدایا؟...... میرا خون پانی ہو رہا ہے لیکن تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو آفاق کے ابا!......“

”آفاق!...... اِدھر آؤ بیٹا...... نہیں، جلدی میں بھی ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ...... میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا...... کیا یہ سچ ہے بیٹا، تم ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے؟“

”اس میں حرج ہی کیا ہے ابا؟ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ ہمیں اپنی زندگی اپنی طرح جینا ہے۔“

”ہمیں کون، بیٹا؟...... تم اور بہو نا......؟ مگر بیٹا، تمہاری ماں کی اور ہم سب کی خواہش ہے کہ ہمیں بھی ہموں میں شامل کیے رکھو...... نہیں بیٹا۔ پہلے میری بات ذرا آرام سے سن لو...... ہماری محبت صرف ایک شخص کے لئے ہی کیوں نہ ہوا، اس میں دراصل وہ ساری محبتیں بھی کام کر رہی ہوتی ہیں جو ہمیں اوروں سے بھی ہوں...... ہاں بیٹا آفاق! ماں یا بہن سے پیار کیے بغیر کوئی اپنی محبوبہ سے پیار نہیں کر سکتا...... ہاں بیٹا۔ جو سب سے پیار کرتا ہے وہی صرف ایک سے پیار کر سکتا ہے...... اب جاؤ خدا تمہاری مدد کرے۔“

باہر سے کھٹکھٹاہٹ سی محسوس کر کے جمال کے ماتھے کے بھیتر دونوں کواڑ ذرا سے ہلے ہیں اور کوئی آواز کیے بغیر چوپٹ کھل گئے ہیں اور وہ ابھی کواڑوں کے اندر باہر ہی ہے کہ اسے پیر سال ممتا کی آواز گرتی پڑتی سنائی دیتی ہے:

”آفاق کے ابا!...... آفاق کے...... نہیں، آفاق، نہیں! میں پاگل نہیں ہوں......!“

جمال نے بڑی گہری...... تھمی ہوئی نظر سے بے تاب آواز کی پرچھائیں کو دیکھا ہے اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لینے کے لیے بے اختیار بڑھ آیا ہے......

”امی!۔ میری پیاری امی!............“

جنابِ عالی!

(محمد مصطفیٰ کے ایک ہی نام سے دلی و کراچی کے دو درخواست دہندگان کی یہ مضحکہ خیز حد تک غیر مربوط اور طویل درخواست ہند و پاک کے ہوم ڈپارٹمنٹ کو بیک وقت یا ذرا آگے پیچھے موصول ہوئی۔)

فدوی اپنے ملک کا ایک صاحب خانہ ادھیڑ عمر شریف شہری ہے اور پیشہ کلاسیکی اردو ادب کی انسان نواز روایات کی اعلیٰ تعلیم سے وابستہ ہے۔ میری عمر میں آدمی اپنی روزمرہ کی گوناگوں پریشانیاں سمیٹنے کی طرف متوجہ ہونے لگتا ہے تاکہ ایک اپنے خدا سے لو لگا کر بقیہ زندگی امن و چین سے بسر کرے، مگر میرا یہ عالم ہے کہ میری تمام تر صلح جوئی اور بے گناہی کے باوصف مقامی پولیس اور انٹیلیجنس نے اپنی روز روز کی بے محل باز پرس سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس تعلق سے جب میں نے اپنے وکیل سے رجوع کیا تو اس نے چار سطری جواب میں ہماری کانسٹی چیوشن سے ہیومن رائٹس کا حوالہ دے کر سرکار کو متنبہ کر دیا کہ افسران کی غیر قانونی حرکات کی روک تھام کا فوری اقدام کیا جائے اور بس۔ اس نے مجھے بہت سمجھایا کہ سرکار لمبی چوڑی چٹھیاں نہیں پڑھتی۔ سرکار سے اپنی چٹھی پڑھوانا مطلوب ہو تو پہلی سطر میں اپنا پرابلم لکھو اور دوسری میں خود ہی اس کا کوئی مربوط حل تجویز کر کے دھمکی آمیز ملائمت سے اصرار کرو کہ تمہاری شکایات رفع کرنے کا ضروری اقدام نہ کیا گیا تو تم اپنے سارے قانونی حقوق محفوظ رکھتے ہو۔ تاہم میری مشکل یہ ہے کہ پورا قصہ بیان نہ کر لوں تو بات کو حلق میں پھنسا ہوا محسوس کر کے میرا دم نکلنے لگتا ہے۔

مگر پوری بات کر پانے کی خواہش سے یہ مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے کہ اس کا وہ سرا ہاتھ میں نہیں آتا جہاں سے اسے شروع کیا جا سکے۔ بہر حال پہلے اپنی شکایات بیان کیے دیتا ہوں: آپ کے سفید کپڑے والوں کی پرچھائیاں گزشتہ کئی ہفتوں سے کچھ اس مانند میرے آگے

پیچھے لگی رہتی ہیں گویا مجھے حراست میں لیے ہوئے ہوں۔ اب تو یہ ہے کہ پرچھائیاں میرے ذہن میں بھی ٹھک ٹھک گھس آتی ہیں۔ فرار کا یہی ایک ٹھکانہ تھا جہاں میں اپنے آپ کو اکٹھا کر کے اپنی صورت حال پر اطمینان سے غور و خوض کر لیتا تھا کہ خود آپ ہی تھانے جا کر اپنے ناکردہ گناہوں کا اقبال کر لوں۔ کون سے گناہ؟...... ہاں، جناب عالی، جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ میرے وہم و گمان میں کیا نہیں؟۔ کہ کلاسیکی اردو ادب میں عشق و محبت کا زیاں والہانہ جی سہہ کر پڑھانے والا ہڈیوں کا ایک بے ضرور ڈھانچہ سرحد پار کی سرکار کا ایک خطرناک جاسوس ہے اور کہ وہ ہمارے ملک کا وہی نظام درہم برہم کر دینے کے درپے ہے جس کی بہتر کارکردگی سے اس کے بیوی، بچوں اور اس کی برتر زندگی کا راست رشتہ ہے اور...... اور کیا؟...... جو بھی جی میں آئے لکھ لیجیے اور میرے دستخط ثبت کروایئے اور۔ اور مجھے پھانسی پر لٹکا دیجیے اور...... اور کیا؟

نہیں، نہیں، جناب عالی، میں نہایت ایمانداری سے اپنی موجودہ ذہنی کیفیت کا آئینہ پیش کر رہا ہوں۔ کوئی دو ماہ پیشتر آپ کی انٹیلیجنس کا ایک افسر مجھ سے چند نہایت ضروری سوالوں کے جواب طلب کرنے ہمارے یونیورسٹی کیمپس میں آدھمکا۔ میں میر کی زبان و بیان کی سادگی اور سچائی پر اپنے لیکچر پر عش عش کرتا ہوا کلاس روم سے اپنے چیمبر میں داخل ہو رہا تھا کہ حضرت نے مجھے اتنے سخت گیر لہجے میں بیٹھنے کی دعوت دی گویا میں انہیں کی طلبی پر ان کے تھانے پہنچا تھا۔

"آج کل آپ کے یہاں اُدھر سے بہت لوگ آ رہے ہیں؟" انہوں نے چھوٹتے ہی استفسار کیا۔

"کدھر سے؟"

"اُدھر سے اور کدھر سے؟"

میں سمجھ گیا، پچھلے مہینے سرحد پار سے میری دادی آئی ہوئی تھی۔

(تم تو ہو بہو اپنے مرحوم ابا نکل آئے ہو! ذری حساب لگاؤ مصطفیٰ تمہارے ابا کو گزرے کے سال ہو لیے ہیں؟)

میں ابھی سالوں کی گنتی بھی نہ کر پایا تھا کہ انسپکٹر صاحب نے مجھے ایک اور سوال کی زد میں لے لیا۔

"بوڑھی عورت کے ساتھ وہ مونچھڑ کون تھا؟ آپ اسے شام کے اندھیرے میں کیا کھچڑی پکانے قبرستان لے گئے تھے؟"

"وہ میرا بھتیجا!۔ وہ میرے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا۔"

"ہماری اطلاع کے مطابق وہ وہاں کی سی. آئی. ڈی. کا خاص آدمی تھا۔"

"نہیں، وہ تو ابھی اردو میں ایم. اے. کر رہا ہے۔ میری عمر رسیدہ دادی کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ آیا تھا۔"

"مگر اُنہی دنوں چھوٹے بازار میں بم پھوٹ سے تین آدمی مارے گئے تھے۔ آپ کو یاد ہے۔"

میں سہم گیا اور سر جھکا کر مرحومین کے حق میں دعائے خیر مانگنے لگا۔

"اور بتائیے۔" انہوں نے میری دعا جھٹک دی۔ "پچھلے بدھ کو آپ وہاں ان کی ایمبیسی میں کیا کرنے گئے تھے؟"

جناب عالی، جو شخص خود آپ ہی اپنے آئین کا بندی ہو اسے آپ کے کارندے قید و بند کی دھمکیاں دینے کیوں وارد ہو جاتے ہیں؟ میرا کسی ایمبیسی سے کیا لینا دینا؟ وہ تو میں کئی دنوں سے ویزے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں۔ کوئی دو ماہ بعد وہاں میری سب سے چھوٹی بہن کی شادی ہونے جا رہی ہے۔ میرے انتظار میں میری اس ننھی سی بہنا کے بال پک چکے ہیں۔ اب بھی اس نے یہی لکھا ہے، تم نہ آؤ گے بھیا تو میں اپنا نکاح روک لوں گی۔ میرے ابا حضور کی موت پر اتنی چھوٹی سی تھی۔ امی اپنی سدھ بدھ کھوئے ہوئے تھی۔ میں ہی اپنی اس بہنا کو کھلاتا اور کھیلاتا پھرتا تھا اور اسے ضدیں کرتے ہوئے پا کر موم ہو ہو جاتا تھا۔ اس کی اس ضد سے بھی منہ موڑ لینا میرے بس کی بات نہیں۔ کیا ہماری کانسٹی چیوشن میں انسانی حقوق صرف اس لیے واضح طور پر لفظ بند ہیں کہ ہم بہ واردات جینے کے بجائے بہ ہدایت بسر کریں اور ان کی متعین حدود کے نشیب پر پگڈنڈیوں سے اتر کر کہیں گھر نہ جا پہنچیں جہاں ہماری بہنوں کا بیاہ ہو رہا ہے اور بھائی اپنے بچوں کو ہماری باتیں سناتے ہوئے اچانک گھنگھور چپ سادھ لیتے ہیں اور دادیاں گم صم منتظر ہیں کہ پوتا لوٹے گا تو وہ اسے پنگھوڑے میں کیسے لٹا پائیں گی۔ اب تک تو وہ اپنے مرحوم باپ سے بھی بڑا ہو چکا ہو گا اور (بیٹھے ہوئے کلیجے میں انبساط کی ایک مبہم لکیر اٹھتی محسوس کر کے) ہو بہو وہی دِکھے گا اور۔ اور بیوہ اور باؤلی مائیں؟ نہ

معلوم ان کی نگہداشت کیوں کر ہوتی ہو گی۔ یااللہ، رحم! ہماری پاگل ماؤں کااور امتحان نہ لے اور انہیں اٹھالے!۔ نہیں، آرام سے، ورنہ ان کی آنکھ کھل جائے گی اور......

نہیں، جناب عالی، ہماری کانسٹی ٹیوشن اگر کسی غیر ملک میں ہمارے اپنوں۔ اتنے ہی اپنوں، جتنے ہم خود آپ اپنے ہیں۔ کی قبروں تک رسائی کے لیے کاریڈار عطا کرنے کی مجاز نہیں تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ جب ہم دل ہی دل میں کاریڈار تعمیر کرلیں اور ہاتھوں کا کاسہ بنا کر فاتحہ کے لیے سر جھکالیں تو ہمیں دہشت گرد قرار نہ دیا جائے۔ دہشت گردوں کو درد اور دعا سے کیاسروکار جناب عالی؟

میں اکیلااور آپ ایک پورا آئینی نظام اور اس کا اتنابڑالشکر! میری کیا جسارت کہ آپ سے لڑنے بھڑنے کادم بھروں؟ اتنی غیر ہموار لڑائی میں کوئی مرے گا تو ایک فرد ہی۔ لڑائی کا تو کوئی مقام ہی نہیں۔ مقام ہے تو صرف اس نکتے کی سوجھ بوجھ کا کہ کسی بھی انسانی آئین سے فطری نظام کے تقاضوں کی نفی نہ ہو۔ فطرت کے عمل میں بیک وقت ہزار تضادات لگے چھپے آپ ہی آپ شیر و شکر ہوتے رہتے ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ نیچر کو بہر حال انسانی بقا کی ذمہ داری سے فرار نہیں۔ سو معاملہ محض قانون برتنے کا نہیں، بلکہ قانون کے ذریعہ انصاف کرپانے کا ہے۔ ایسا انصاف، جس کی بدولت نفوس اور اشیاء کی فرداًفرداً شناخت کا اسباب ہو جائے، اسی لیے جب کوئی خوشحال معاشرہ طعام و نوش کے بعد رنگ رلیاں منانے میں مگن ہوتا ہے تو اللہ میاں ان دوچار افراد کی تلاش میں نکلا ہوتا ہے جو کسی تاریک کونے میں بھوکے پیٹ سوگئے ہوں۔ جمہوری اخلاق میں یہ احتیاط لازم ہے کہ آئین کہیں اندھے کی لاٹھی کی طرح مظلومین کے سر بھی پھاڑ کر نہ رکھ دے۔

فدوی کی گزارش ہے کہ ہمارے آئین کے فیاضانہ پہلوؤں کی غیر ہمدردانہ ٹٹول سے اجتناب برتا جائے۔ کسی قوم کے اجتماعی آلام دراصل اس کے ایک ایک فرد کے ذاتی آلام کے ہی اجتماع کا منظر نامہ ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے، جب میری دادی مجھ سے گلے ملنے کی برسوں کی تمنا سے سہک سہک کر بالآخر میرے دروازے پر آن گرتی ہے تو میرا اس کی طرف لپک کر ہولینا قابل گرفت کیوں قرار دیا جائے؟...... کیوں کہ وہ دشمن ملک کی شہری ہے؟...... کیا ممالک از خود دشمن ہوتے ہیں یا ممالک کے باشندے؟۔ اور اگر باشندے دشمن ہوتے ہیں تو میری دادی کیا مجھے قتل کرنے یہاں آپہنچی تھی؟

جناب عالی، ایک دفعہ دو بھائیوں نے آپس میں لڑ کر اپنے باپ دادا کی زمین بانٹ لی اور الگ الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا، مگر دنیا بھر کی زمین کی خاصیت تو وہی ایک ہوتی ہے، یعنی اس کے بیٹوں بیٹیوں کی پرورش کے لیے اس کی چھاتی پر اُگن کا سلسلہ نہ ٹوٹے، سو جو ہوا وہ یہ کہ دونوں بھائیوں نے زمین پر جو لکیر کھودی تھی اس پر بھی اس میں مخفی بیج دھان بن کر پھوٹ آیا۔ خدا کی قدرت تو متقاضی ہے کہ چار سو بہار ہی بہار ہو اور اس کے بالے بالائیں مل جل کر کھیلتے کھاتے رہیں۔ بتائیے اب، اس تعلق سے آپ کیا فرمائیں گے؟

حب الوطنی؟...... ہم وطن کون ہوتے ہیں؟۔ وہی لوگ نا جن سے آپ اور میں فطرتاً محبت کرتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں بھی جا بسیں، انگلستان میں، یا آذربیجان میں، یہ میرے دل میں ہی بسے ہوتے ہیں، میرے بیوی بچے، بہن بھائی، ماں باپ اور۔ اور میری وہ سگی دادی جو اپنے کلیجے کی آگ میں عمر بھر بھنتی رہی۔ دوست احباب سے تو ہمارا پہلا واسطہ ہمارے وجود سے باہر کہیں ہوتا ہے، اسی لیے دوست کہیں بھی بنائے جا سکتے ہیں، مگر خون کے خلیے تو خون میں ہی ہوتے ہیں۔ بتائیے کیا اپنی فیملی کے بغیر میں سالم کھڑا رہ سکتا ہوں؟ نہیں کیوں؟ کیا میں اپنے وجود کا مکین نہیں ہوں؟۔ جناب عالی، گھر کے لوگ سارا دن جہاں بھی رہیں، رات کو سونے کے لیے بلا ناغہ گھر لوٹ آتے ہیں۔ کوئی لوٹنے سے رہ جائے تو ہمارے دلوں میں آندھیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ فدوی کو سمجھائیے وہ اپنے ان لوگوں سے واسطہ کیسے توڑ لے؟ آپ کے انٹیلیجنس کے ایک افسر نے مجھے مشورہ دیا تھا، وطن کی محبت کا تقاضہ ہے کہ اب سرحد پار کے سبھوں کو بھول جاؤ، صرف اُنہی کے ساتھ رہو جو واقعی تمہارے ساتھ ہیں، مگر انسان کو اسی لیے تو زوال نہیں کہ رفتگان نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اسے اپنے دل و دماغ میں محسوس ہونے لگتے ہیں اسی لیے تو میرا مرحوم باپ جوں کا توں زندہ ہے۔ اپنا حافظہ کھو کر میں......

مگر پہلے میں آپ کو ایک چھوٹا سا سچا واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارا آبائی گاؤں کئی میلوں میں ایک ساتھ پھیلے ہوئے ایک بڑے گھنے جنگل کے کنارے واقع تھا۔ اس جنگل میں بھانت بھانت کے بے شمار جانور رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جنگل میں آگ لگ گئی اور آناً فاناً چار سو پھیل گئی۔ افراتفری میں جانور ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کئی روز تو وہ آگ میں ہی بھاگتے پھرے، اور پھر جب آگ ٹھنڈی ہوئی تو پناہ گزینوں نے یہ دیکھ

کر سارا جنگل چیخوں سے سروں پر اٹھالیا کہ ان کے اقرباء تو پیچھے ہی رہ گئے ہیں، مگر خوش قسمتی سے جانوروں کا حافظہ لمبا نہیں ہوتا، لہٰذا وہ چند ہی روز میں انہیں یکسر بھول گئے اور ہنس کھیل کر اپنی کوری زندگی بسر کرنے لگے۔

مگر بنی نوع انسان بے چارہ اپنے حافظے کے کانٹے کا کیا کرے جو اس کے ذہن میں ایک سیدھ میں گڑا ہوتا ہے؟ اسے باہر نکال پھینکے؟ کیسے؟...... اپنے حافظے سے ہی تو اس کی انسانی خو منسوب ہے جس باعث وہ کائنات کی چھت پر متمکن ہے۔ سوچ کر بتایئے، جب فدوی کو اپنی گم شدہ بہن کا چہرہ بھول جائے گا تو اس میں اور ایک بندر میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اگر اپنا ماضی اسے مستقبل میں پیش نہ آتا رہے تو اس کی تہذیب کیوں کر ہوتی رہے گی؟ مجھے اپنے خون میں کسی عہد گزشتہ کی گھوڑے کی ٹاپ کی آہٹ پیش آنے لگی ہے جب میرے اجداد میں سے کوئی روٹی روزی کی تلاش میں اپنے مستقبل کے پیچھے جادوئی گھوڑے پر اڑتے ہوئے وسط ایشیا سے سرزمین ہند میں وارد ہوا تھا اور اپنے گردو پیش حسن و خوراک کی افراط دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھا تھا۔ خوب تراز متخیلہ!۔ اور دلی کے نواح میں کسی مقامی لشکر میں بھرتی ہو گیا تھا اور جو عورت اسے سب سے پہلے نظر آگئی اسے ہی قدرت کا عطیہ سمجھ کر اس سے فوراً نکاح پڑھوالیا تھا۔ سیاہی مائل الا خوبروست:...... اور یہیں بس گیا تھا...... واپسی؟۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ واپسی پر روک ٹوک نہیں، اس لیے اسے کبھی واپس جانے کا خیال ہی نہ گزرا تھا۔ جب سرحدوں پر پہرے نہ ہوں تو دور دراز پر بھی ہم اصل میں اسی پرانے گھر کی چار دیواری میں جوں کے توں بیٹھے ہوتے ہیں، مگر گھر کا ایک فرد سرحد کے اُس پار ہو اور دوسرا اِس پار اور خیر و خبر پر کڑا پہرا ہو تو براہ کرم فدوی کو ہدایت کیجیے کہ وہ اپنے خون میں گھوڑے کی ہمہ وقت ٹاپ سے کیسے نجات حاصل کرے۔ اس کا جی کیوں نہ چاہتا رہے کہ موقع ملتے ہی اچھل کر ادھر جا پہنچے۔

ہاں، اس میں شک نہیں کہ دہشت گردی کے باعث ہر دو جانب زندگی زیر وزبر ہو گئی ہے، مگر جناب عالی، آپ کا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ پیشہ ور دہشت گرد تو بے روک ٹوک آجا رہے ہیں مگر دھر وہ لیے جاتے ہیں جو اپنی فطری محبتوں کی تاب نہ لا کر جھٹ ادھر سے ادھر کا قصد کر لیتے ہیں۔ ذرا سوچیے، ماں بہن سے گلے ملنے کی بے تاب خواہش آدمی کو دہشت گرد بناتی ہے یا درویش؟ سرکار کے شکوک کا نشانہ بن بن کے اگر کوئی شخص واقعی

دہشت گرد نہ بن جائے تو یہ امر زیادہ تعجب خیز ہوگا۔ میں...... مجھے تو سرحد پار کے اعزاء کی سالہا سال کی جدائی کے بعد اب معلوم ہونے لگا ہے کہ وہ...... میرے منہ میں خاک!...... مر کھپ چکے ہیں۔ مرحومین سے تو مرے بغیر ملا نہیں جاسکتا، لہٰذا ایک نہایت ذمہ دار شہری ہونے کے باوصف، میں سوچتا ہوں کہ کسی پیشہ ور دہشت گرد کا حلیہ اختیار کر کے سرحد کی طرف بڑھ جاؤں اور ادھر یا ادھر کی گولیوں کی بوچھار میں اپنی جان کو وہیں چھوڑ کر سرپٹ بھاگتے ہوئے اپنی دادی کی گود میں جاگروں۔ نہیں، جناب عالی، میں بڑا زندگی پرست انسان ہوں، تاہم جب زندگی ہی موت بن جائے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ مر کر ہم جی پڑیں گے اور بچھڑے ہوؤں سے جاملیں گے اور ہمیں چین آجائے گا۔

جناب عالی، فدوی معافی کا خواستگار ہے کہ اپنی بات کو قانونی مہارت سے سمجھانے سے قاصر رہا ہے، یا پھر اپنی وہ بات سرے سے کہہ ہی نہیں پایا جسے پیش کرنے کے لیے اس نے اپنی یہ عرض داشت رقم کی ہے۔ دریں حالات میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ خود ہی اپنے ہمدردانہ غور و خوض کے لیے میرے عذاب کا قانونی ڈرافٹ تیار کر لیں۔

(ہند و پاک کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے دونوں متعلقہ کلرک یہ عرضداشت پڑھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اس پر "نو ایکشن" کا مشورہ ثبت کر کے اسے اپنے اپنے ہیڈ کلرک کو بھیج دیا۔ ہیڈ کلرک پہلے تو اپنی منجھی ہوئی سوجھ بوجھ کو کام میں لا کر سوچا کیے اور پھر اچانک اس خیال پر چونک پڑے کہ محمد مصطفیٰ ضرور کوئی پہنچا ہوا آدمی ہے۔ اس شخص کی پوری پڑتال ہونی چاہیے۔ وہ اپنے اپنے محمد مصطفیٰ کی درخواست کو سیکرٹ فائیل میں لپیٹ کر باس کے کمرے کی طرف ہو لیے، مگر ہر دو افسران بالا کے کمروں کے باہر یہ تختی آویزاں تھی کہ ڈسٹرب مت کرو۔ اندر ایک ہنگامی میٹنگ چل رہی تھی۔ اِس میٹنگ میں دہشت گردوں کو بیدریغ کچلنے کے لیے سیکورٹی کو جدید تر ہتھیاروں کی فراہمی زیرِ بحث تھی)

طلسمِ ہوشربا

آج پورے چاند کی رات ہے اور شہر سے دور اس غیر آباد علاقے میں سنگ مرمر کا راج بھون کسی اطلس پوش مردے کی طرح بے سانس بشاشت سے کھڑا ہے اور بائیں لان پر نظر جمائے ہوئے ہے جہاں ہز اَیکسیلینسی گورنر بہادر رام پرساد نے اپنے پچپنویں جنم دن پر ایک نجی ڈرنکس اینڈ ڈنر پارٹی کا اہتمام کر رکھا ہے۔

اس جانب گورنر اور اس کے چند خصوصی احباب ایک بڑی میز کے ارد گرد بیٹھے ہیں اور وہ انہیں جذباتی وابستگی سے اپنی ہیرو سکول کی ٹائی دِکھا رہا ہے۔ ''ہر جنم دن پر میں اپنے پرانے سکول کی یہ ٹائی پہنتا ہوں۔'' ان دنوں کی آہٹ پا کر اس کے بڑے بڑے کان تن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ''مائی گڈ اولڈ ہیرو سکول! میں نے اپنا سکول سرٹیفکیٹ وہیں سے کیا تھا۔'' چند ایک مہمانوں نے دم روک لیا ہے کہ ان کی موجودگی کے احساس سے ڈسٹرب ہو کر گورنر اپنی دنیا سے باہر نہ آجائے۔

البرٹ۔

یس سر۔

للّی۔

یس سر۔

پراساد۔ پراساد۔

نو سر! پراساد نے کھڑے ہو کر اپنے منہ میں ٹھنسی ہوئی سالم پیسٹری کو کلوں میں سرکا کے بہ مشکل اپنی حاضری کا جواب دیا اور ساری کلاس ہنسنے لگی ہے۔

گورنر نے ہنستے ہوئے دہرایا ہے۔ ''مائی ویری گڈ اولڈ ہیرو سکول!''

میک اے کامپلیکس سینٹینس:

گاندھی ہندوستان کا ایک ننگا فقیر ہے۔
ہندوستان میں کروڑوں بھوکے ننگے لوگ رہتے ہیں۔
یہ لوگ کسی کی بھی نہیں سنتے۔
کیا ایک بھوکا ننگا فقیر ایسے لوگوں پر حکومت کر سکتا ہے؟
میں بتاؤں سر؟۔
یس۔ پرساد تم ہی بتاؤ۔

گورنر نے پھر اپنے مہمانوں کو بتایا ہے۔ ''میں نے اپنا اسکول سرٹیفکیٹ ہیرو سے ہی کیا تھا۔'' اور بڑی فخر مندی سے اضافہ کیا ہے۔ ''میرے دو بچے بھی آج کل وہیں تعلیم پارہے ہیں۔''

''مگر مجھے تو یہ اچھا نہیں لگتا'' گورنر کی بیوی نے اپنے سکاچ وہسکی کے گلاس کو منہ کی طرف لے جاتے ہوئے روک لیا ہے۔ ''کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اے. بی. سی. سیکھنے کے لئے ولایت بھیج دیا جائے۔ اس نے اپنے بچوں کی جدائی کو حلق سے اتارنے کے لئے وہسکی کے گھونٹ تیز تیز بھر لئے ہیں۔ ''رام، اپنے ہیرو جیسے اسکول تم یہیں اپنے دیش میں کیوں نہیں کھلوادیتے؟''

''ارے بھئی۔'' گورنر نے اپنے وہسکی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔ ''ویسے سکول تو کھل سکتے ہیں مگر وہ لوگ یہاں کہاں؟''

''تو انہی کو یہیں بلالو۔''

''بلا تو لیں بھابی۔'' گورنر کا چھوٹا بھائی ڈاکٹر بدری پرساد ہنستے ہوئے بول پڑا ہے۔ ''مگر ڈر یہ ہے کہ وہ پھر سارے دیش پر اپنا قبضہ جمالیں گے۔''

''تو کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟'' سیٹھ محمد بھائی صنعت کار کی آواز گویا کسی بگڑی ہوئی مشین سے برآمد ہوئی ہے۔ ''ہم انہیں ایک بار پھر نکال دیں گے۔''

''انہیں بلالیں گے، پھر نکالیں گے، پھر بلائیں گے، آپ میری طرح وہیں کیوں نہیں جابستے؟''

گورنر نے انہیں مطلع کیا ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی بدری پرساد انگریزی شہریت اختیار کر چکا ہے اور ایک اسپتال میں سرجن ہے۔

ڈاکٹر توحید نے جو گورنر کا فیملی ڈاکٹر ہے، دونوں میاں بیوی کو غٹ غٹ شراب پیتے ہوئے دیکھ کر فکر مندی سے سوچا ہے کہ پہلے ہی اس کا کلاسٹرل اور شوگر نارمل سے اوپر ہے اور کندھے جھٹک کر اپنا رخ ڈاکٹر بدری پرساد کی طرف پھیر لیا ہے۔ "ہمارا دل تو آپ کے ہی ملک میں بسا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب، مگر کیا کریں؟"

"کرنا کیا ہے؟ دل وہاں بسا ہوا ہے تو آپ بھی وہیں جابسیے۔" ڈاکٹر بدری پرساد نے اسے جواب دیا ہے۔ "دل کے بغیر آپ یہاں بھوتوں کے مانند کیوں جیے جا رہے ہیں؟"

"نہیں، بدری پرساد۔" گورنر نے اپنے بھائی کو مخاطب کیا ہے۔ "ڈاکٹر توحید وہاں جا بسا تو تمہاری بھابی اور میں واقعی اپنے بھوت بن کر رہ جائیں گے۔"

"نہیں سر۔" ڈاکٹر توحید نے کہا ہے۔ "آپ کو چھوڑ کے تو میں جنت میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"جنت جا پہنچے ڈاکٹر تو بھوکوں مرو گے۔" گورنر ہنستے ہوئے اپنا کنگ سائز امپورٹیڈ سگریٹ سلگانے لگا ہے۔ "وہاں کوئی بیمار نہیں ہوتا، تمہارے پاس کون آئے گا؟"

"میں۔" اس کی بیوی جھٹ بولی ہے۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ میرے گھٹنوں کا درد مر کر بھی ٹھیک نہ ہوگا۔"

"لیکن میری پوسٹنگ جہنم میں ہوئی تو جنت میں رہو گی کس کے ساتھ؟"

"اگر جہنم میں بھی تم گورنر ہی بن کر گئے تو جنت کیا اور جہنم کیا؟ کیا یہ ملک جہنم سے کچھ کم ہے؟"

گورنر کی بیوی نے اپنے گلاس خالی کر کے رکھا ہے اور قریب ہی کھڑے بیرے نے اسے اتنی مؤدب خاموشی سے بھر دیا ہے کہ وہ کسی کو دکھائی ہی نہیں دیا ہے۔ "ارے یہ میرا گلاس اپنے آپ کیسے بھر گیا؟"

"تمہاری خواہش سے بھابھی۔" ڈاکٹر بدری پرساد نے اسے بتایا ہے۔ "اگر میں بھی اپنے بھائی کا بھائی ہونے کے بجائے اس کی بیوی ہوتا تو میرا سب کچھ بھی آپ ہی آپ بھرتا چلا جاتا۔"

"مگر اپنے بھائی کا بھائی ہونے سے بھی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہوگا۔" اس کی بھابھی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے اسے جواب دیا ہے۔

"ہاں کیوں نہیں، ورنہ مجھے اپنی اتنی سویٹ بھابھی کے کلوز اپ کیسے نصیب ہوتے؟"

"چلو ہٹو۔" دیور کی بھابھی نے اپنا گھٹنوں کا درد بھول کر اپنے خضاب کیے ہوئے ترشے بالوں کو جھٹک دیا ہے۔ "کب تک کنوارے بیٹھے رہو گے بدری؟ اب کسی میم کو گھر میں ڈال لو۔"

گورنر کی بیوی کی طرف محبت اور توصیف اور عقیدت سے دیکھتے ہوئے محمد بھائی اپنے منہ میں کافی دیر سے روکے ہوئے کلمات کو مزید نہیں روک سکا ہے۔ "مادام، میں نے تو آپ کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

"کون سی تجویز؟" مادام نے اپنے سگریٹ ہولڈر میں کنگ سائز سگریٹ فٹ کر کے اپنی نشیلی آنکھیں حیرت اور مسرت سے پھیلا لی ہیں اور نقلی دانتوں کی نمائش کرنے لگی ہے۔ "ارے کتنا لمبا ہے رام!"

ڈاکٹر توحید نے حساب لگایا ہے کہ یہ اس کا پانچواں سگریٹ ہے اور وہ ابھی اپنا منہ کھولنے کی سوچ ہی رہا ہے کہ محمد بھائی گویا ہوا ہے۔ "میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم یہیں آپ کے پڑوس میں ہیروسے بھی بڑا اسکول کھولیں گے۔"

"اسکول تمہاری کوئی فیکٹری نہیں محمد بھائی۔" گورنر نے اسے ٹوکا ہے۔ "کہ راتوں رات اسے کھڑا کر کے پروڈکشن شروع کر دی جائے۔ اسکول ہمارے تمہارے مانند پیدا ہوتے ہیں، انہیں بنایا نہیں جاتا۔ کیوں شری دھرم راج؟"

دھرم راج راجیہ کا نوجوان منسٹر فار ایجوکیشن ہے۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں سر، مگر میں نے آج ہی کہیں پڑھا ہے، امریکہ میں یہ وچار زور پکڑ رہا ہے کہ بچوں کو پیدا کرنے کی بجائے انہیں سیدھا بنا لیا جائے یا فوری طور پر ضرورت نہ ہو تو ہیومن سپرمز کا بینک بنا کے انہیں آئندہ کے لئے سورکشت کر لیا جائے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا۔" ڈاکٹر بدری پرساد نے اپنی سوچ سے گدگدی سی محسوس کرتے ہوئے رائے دی ہے۔ "آئندہ تین چوتھائی یا اس سے بھی زیادہ انسانی آبادی بوتلوں میں ہی جیا کرے گی اور...... ہہ ہا...... ہہ پیدا ہوئے بغیر ہی غیر فانی ہو جائے گی۔ ہہ ہا......!"

"ہہ ہا۔ ہہ ہا۔!" پروفیسر اچپت لعل کرم چند، جو راجیہ کے ایک مشہور سائنسی ادارے کا ڈائرکٹر ہے، فوارے کے مانند چھوٹ پڑا ہے۔ "سائنسی دریافتیں کتنے تضادات کھڑے کر

رہی ہیں۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔" دھرم راج نے اسے سمجھانا چاہا ہے۔ ہمارے دھرم نے ہمیں پراچین کال میں کھول کر بتادیا تھا کہ مرتا وہی ہے جو پیدا ہوتا ہے۔"

"یو آر اے ینگ، اولڈ فِب، شری دھرم راج۔" گورنر نے ہنس کر کہا ہے۔ "سیاست دانوں کی یہ خوبی انہیں کامیاب بناتی ہے کہ سائنس ہو یا مذہب، جہاں سے بھی کوئی کام کا نکتہ ملے اسے اپنے کانٹیکسٹ (Context) سے اکھاڑ کر چلتے بنو۔"

"جی ہاں، ایکسیلینسی۔" دھرم راج نے بڑی انکساری سے کہا ہے۔ "ہمارا کام تو یہی ہے کہ بھانت بھانت کے پھول توڑ کر قوم کو گلدستہ بھینٹ کر دیں۔"

"قوم؟" ڈاکٹر بدری پرساد نے بے چین ہو کر پوچھا ہے۔ "کون سی قوم؟ یا کہیں آپ قوم کو کراوڈ کا ہم معنی تو نہیں سمجھتے؟"

"ایک بات بتاؤں رام۔" نشے کی افراط سے گورنر کی بیوی یاس کی دلدل میں اتر رہی ہے۔ "بعض دفعہ بیٹھے بیٹھے میں بے اختیار چاہنے لگتی ہوں کہ تمہارے راج بھون سے بے جھجک نکل کر کراوڈ میں کھو جاؤں۔ مجھے لگتا ہے۔ جیسا کہ دھرم راج نے بتایا ہے...... مجھے لگتا ہے میں کسی بوتل میں کلبلائے جا رہی ہوں۔ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی اور پیدا ہونے سے ڈرتی ہوں کہ مر جاؤں گی، کھو جاؤں گی، مگر سچ پوچھوں رام، تو میرا جی چاہتا ہے بوتل میں سے اچھل کر باہر آجاؤں اور کراوڈ میں کھو جاؤں۔"

"کہیں تم نے لیڈر بننے کی تو نہیں ٹھان لی بھابھی۔" پھر ڈاکٹر بدری پرساد نے سب کی طرف رخ کر لیا ہے۔ "یو نو، آج کل دنیا بھر میں ویمین لیڈرز کی لہر چلی ہوئی ہے۔"

"میرا مذاق مت اڑاؤ بدری۔ لے جا سکتے ہو تو مجھے اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاؤ۔" اس نے پھر اپنا گلاس تھام لیا ہے۔ "میں اپنے بچوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی اچپت لعل کرم چند کی دھرم پتنی نے بڑے ہمدردانہ انداز میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

"ہاں ہاں بدری، اپنی بھابھی کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے جاؤ۔" گورنر نے چہک کر کہا ہے۔ "وہیں کی کوئی بات سناؤ، بدری۔"

"انگلینڈ از گریٹ!"

"یس اِن ڈیڈ۔ اینڈ سو اِز دا انگلش مین، اَینٹ اِٹ؟" اپنے گلاس سے سکاچ اینڈ سوڈا کے دو تین سپ لے کر گورنر کو اپنا گلا کھلتا ہوا محسوس ہونے لگا ہے۔ "ہندوستان کو آزادی دلوانے اور آزادی دلوانے کے بعد اسے بنائے رکھنے میں سب سے بڑا ہاتھ ایک انگلش مین کا ہی تھا۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟"

"وہائی! لارڈ ماؤنٹ بیٹن، سر۔"

"نو پروفیسر،" گورنر نے پروفیسر اچت لعل کرم چند کو جواب دیا۔ "سائنس کا آدمی اپنے سامنے اتنے ہی فاصلے تک دیکھ پاتا ہے جتنا اسے عینک کے پیچھے سے دکھائی دیتا ہے، اس کے آگے کی اسے سوجھتی ہی نہیں۔"

"نہیں سر۔" محمد بھائی نے ہنس کر کہا ہے۔ "ہمارے پروفیسر کی قریب کی نظر بھی بہت کمزور ہے۔ دیکھئے، اپنے گلاس سے پینے کی بجائے اس وقت وہ میرا گلاس اٹھائے ہوئے ہیں۔"

"مگر میری بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ سوچ کر بتاؤ دوستو، وہ انگلش مین کون تھا؟"

"ارے ہاں۔" ڈاکٹر بدری پرساد اچھلا ہے۔ "اور کون؟ پنڈت نہرو۔"

گورنر نے فوراً اپنا گلاس اٹھالیا ہے۔ "چیئرز ٹو دا جینئس آف مائی برادر!۔"

لان کے دوسرے کنارے پر نوجوانوں کا ایک گروپ بیٹھا ہے جس کی صدارت گورنر کا بڑا بیٹا کر رہا ہے۔ وہ پروفیسر اچت لعل کرم چند کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کا اسٹوڈنٹ ہے۔

ایک نوجوان نے اپنے ساتھی کو ٹہوکا دے کر جملہ کسا ہے۔ "بڈھوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

اس کے ساتھی نے جواب دیا ہے۔ "مجھے ان کے شور سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ میرا ڈیڈی اتنا شور مچایا کرتا تھا کہ میرا گھر میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔"

"آرڈر! آرڈر!" گورنر کے بیٹے نے اپنی نیٹ (Neat) سکاچ کے دو تین گھونٹ پی کر اپنے ساتھیوں کی توجہ چاہی ہے۔ "تو کیا ہم اتفاق رائے سے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی ینگ لیڈرز پبلک ویل سوسائٹی کو کل ہی رجسٹر کروالیں گے؟"

"یس۔" کسی نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا ہے۔ "تمہیں پوری اتھارٹی ہے کہ سوسائٹی کو رجسٹرڈ کروالو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب سوسائٹی کے یہ مقاصد بھی ایک بار پھر سن لو اور اپنی منظوری دے دو۔"

"ارے چھوڑو، گورو، مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ مل بیٹھیں گے کھائیں پئیں گے، ہنسیں کھیلیں گے، کیوں سیما؟" بولنے والے نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا ہے جو ووڈکا میں آرنج ملا کر پی رہی ہے۔

"تم بھی یہ ڈرنک پی کر دیکھو ستیش۔" سیما نے اسے جواب دیا ہے۔ "اتنا مزا آئے گا کہ مجھے گلے لگالو گے۔"

"نہیں، تمہیں گلے لگا کر پیوں گا تو مزا آئیگا۔"

"بس دو ایک منٹ لگیں گے یار" گورنر کا بیٹا اصرار کرنے لگا ہے کہ سوسائٹی کے مقاصد سن لئے جائیں۔ "اے، ہر ممبر کو چھ سو روپے سالانہ ممبر شپ فی ادا کرنی ہو گی۔ بی، ہر چھ ماہ پر ایک کانسرٹ کم ڈنر کا اہتمام کیا جائے گا جس میں داخلے کا حق صرف ممبروں کو ہو گا۔"

"نہیں اس میں ترمیم کرو کہ ہر ممبر اپنا ایک مہمان ساتھ لا سکتا ہے۔"

"ہاں شرط یہ ہے کہ اگر وہ لڑکا ہو تو لڑکی لائے۔"

"اور لڑکی ہو تو لڑکا۔" سیما نے ستیش کے کندھے پر بازو ڈال کر کہا ہے۔

"کیا تمہیں معلوم ہے اشوک سومنات سٹیٹس سے ایک آسٹرین لڑکی لے آیا ہے؟ اس کی ناک اتنی موٹی ہے کہ اس کی اوٹ میں وہ دکھتی ہی نہیں ہے۔"

"میں بھی اگلے سال کے شروع میں سٹیٹس جارہا ہوں انجو۔"

"اب آگے سنو پلیز۔ "گورنر کے بیٹے نے اپنی آواز کو اونچا کر لیا ہے۔ "سوسائٹی ہر سال دو غریبوں کو بلا فیس ممبر شپ کا حق دے گی۔"

"ہیر! ہیر! اس میں یہ بڑھا دو کہ فری ممبر شپ کے لئے لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔"

"آگے سنو۔ ہماری بحث میں آیا ہے کہ ہمارے دیش کے لوگ عادتاً بڑے گندے ہیں۔"

"جسمانی طور پر ہی نہیں اخلاقی طور پر بھی۔" ایک بھورے بالوں والی لڑکی پھنکاری

ہے۔ ”میں کہیں سے بھی گزرتی ہوں تو پیچھے سے سیٹیاں بجا بجا کر پریشان کر دیتے ہیں۔“

”مگر اس وقت تو میرا بھی جی چاہ رہا ہے رکو، کہ سیٹی بجادوں۔“

”تمہیں تو سیٹی بجانا آتا ہی نہیں۔“

”تو پھر بجادوں؟“

”بجادو تو مجھے اور کیا چاہئے۔“

”آرڈر! آرڈر! سوسائٹی ہر سال شہر کا ایک گندا محلہ اڈاپٹ کرے گی تاکہ......“

”شہر کے تو سارے محلے گندے ہیں۔“

”نہ بابا۔“ رکو اپنے آپ کو دوست کے بازوؤں سے چھڑا کر بولی ہے۔ ”میں تو ان گندے محلوں کی صفائی کے لئے کبھی نہیں نہ جاؤں گی۔“

”مہترانی کا نیا لباس تم پر اتنا پھبے گا کہ دیکھنے والے پاگل ہو جائیں گے۔“

”رکو، ہمارے بنگلے کی صفائی کے لئے ایک بڑی خوبصورت لڑکی آیا کرتی تھی...... ارے شمبھو داس صرف لائم جوس پی رہا ہے۔ لاؤ! میں اس میں اپنی شراب ملائے دیتا ہوں...... نہیں کیا؟ تو کیا الگ سے منگواؤں؟ بیئرر۔!“

”آرڈر! میں تمہیں بتا رہا تھا......“

”ارے بھائی جو چاہتے ہو لکھ لو۔ بور کیوں کر رہے ہو؟ گندے لوگوں کو صاف رہنا سکھا بھی دو گے تو صفائی کے لئے ان کے محلوں میں پانی کہاں سے لاؤ گے؟ ہر محلے میں بس دو ایک میونسپلٹی نل ہوتے ہیں، سو وہ بھی بند۔“ معلوم ہوتا ہے کہ بولنے والے نے بہت زیادہ چڑھالی ہے۔

”اور ان کے لئے نل بھی کھلوا دو گے تو ان کے لئے لکس یا لائف بوائے کہاں سے آئے گا؟ سو یہ بھی بند۔ اور اگر لکس یا لائف بوائے لا بھی دو گے تو وہ کمائی کرنے جائیں گے یا صابن مل مل کر اپنی میل دھوتے رہیں گے؟ سو......“

”یہ بھی بند!“ سبھوں نے ایک ساتھ بہ آواز بلند کہا ہے اور قہقہہ لگانے لگے ہیں۔

”بچے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں؟“ لان کی دوسری طرف گورنر نے کہا ہے اور پھر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر پوچھا ہے۔ ”میں کیا بتا رہا تھا؟“

”آپ بتا رہے تھے کہ اس لان کے پیچھے انگریزوں کا ایک نہایت پرانا قبرستان ہے۔“

''ہاں میں جب نیا نیا یہاں آیا تو قبرستان کا یہ گوشہ ایک گھنا جنگل بنا ہوا تھا۔ مجھے بہت برا لگا۔ اگر ہم قبروں پر پھول نہیں اگا سکتے تو کم سے کم اتنا تو ہونا چاہئے کہ مُردوں کے سینوں پر ہمہ وقت سانپ اور بچھو نہ لوٹتے رہیں۔ میں نے یہ جنگل صاف کروا دیا تو میری آنکھیں کھلی رہ گئیں...... برٹش ہنر مندی سے بنائے ہوئے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پکے گھر ایک دم میری نظروں میں آباد ہو گئے۔ اتنی گنجان آبادی مرے ہوؤں کی کیونکر ہو سکتی ہے؟'' اپنی بات میں دلچسپی محسوس کرتے ہوئے گورنر کو پائپ کی اشتہا ہوئی ہے اور اس نے اپنی سگریٹ بجھا کر پشت پر اپنے سپیشل سٹیورڈ کی طرف دیکھا ہے جس نے اس کی خواہش فوراً بھانپ لی ہے اور ''لیس سر'' کہہ کر ایک طرف سرک گیا ہے۔

''میں نے ایک آدمی کو وہاں کی دیکھ بھال کی خاص ڈیوٹی دے رکھی ہے اور اپنے خالی وقت میں اکثر ادھر جا نکلتا ہوں۔''

''یوئر پائپ اینڈ پاؤچ سر۔''

''تھینک یو۔'' گورنر نے سٹیورڈ سے پائپ اور پاؤچ لے لئے ہیں، پھر پائپ میں تمباکو ڈال کر اسے اپنے متحرک ہونٹوں میں کس کر باندھا ہے اور پھر تمباکو سے آگ چھوڑتے ہوئے جو ایک لمبا کش لیا ہے تو پائپ سے ایک شعلے کو بلند ہوتے دیکھ کر شاید اس کی نظر میں قبرستان کے کسی مردے کی مانوس شکل اچھلی ہے اور سبھوں نے اس کی جانب آسیبی انہماک سے منہ لٹکا لئے ہیں۔

''اتنے دنوں بعد آج میں ہر قبر سے اتنا مانوس ہو چکا ہوں کہ اس کے قریب پہنچتے ہی وہی شخص ہو بہو میرے سامنے آ جاتا ہے جو وہاں دفن ہوتا ہے مجھے یہ باور کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اس شخص کی عین یہی شکل ہو گی۔ تم لوگ نہیں ماننا چاہتے تو مت مانو مگر سبھوں کی شکلوں کے الگ الگ نقوش میرے ذہن میں کھنچے ہوئے ہیں۔''

''تعجب ہے!''

''ہاں تعجب تو ہونا ہی چاہئے۔ قبرستان میں قدم دھرتے ہی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ انگلینڈ کے کسی مقام پر آ پہنچا ہوں۔''

''مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں لے جایا کرو، رام۔'' گورنر کی بیوی نے بے اختیار خواہش

کی ہے۔

"ہاں ڈارلنگ لے جایا کروں گا۔" گورنر اپنے پائپ کے منہ میں انگار کو پھیلانے لگا ہے تاکہ بھرپور دھواں کھینچ سکے۔

"انگریزوں کے بارے میں تو مشہور ہے سر۔" پروفیسر اچپت لعل کرم چند نے منہ کھولا ہے۔ "کہ زندہ یا مردہ جہاں بھی جا پہنچتے ہیں وہیں اپنا چھوٹا سا انگلینڈ بنا لیتے ہیں۔"

"ہاں، دی انگلش مین از این انگلش مین ایوری ویئر۔" پائپ میں انگار رچ بس گیا ہے اور گورنر نے اسے ہونٹوں میں دبا کر ایک لمبا کش لیا ہے۔ قبرستان کی انٹری پر ایک جنرل کی قبر ہے۔ اس کا کتبہ پڑھتے ہوئے مجھے ایک مکمل انگریز کے کردار کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تم بھی سنو۔ لکھا ہے کہ عین اسی پل اسے انگلینڈ لے جانے کے لئے جہاز کو چھوٹنا تھا جس پل وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔"

"اس پیراڈائز میں پہنچا، یا اس میں، بات تو ایک ہی ہے۔"

"ہمارے ہندوستانیوں کو تو وقت کی بالکل قدر نہیں۔"

"اسی لیے ہیل کا گیٹ پیٹتے رہتے ہیں۔" گورنر نے رائے دی مگر ابھی وہ قبرستان کے بارے میں اپنی ایک واردات کو بیان کرنا چاہ رہا تھا۔ "چار چھ ماہ پہلے آج جیسے ہی پورے چاند کی ایک رات میں ادھر جا نکلا اور ابھی چند گز ہی چلا ہوں گا کہ اچانک مجھے اپنے آگے آگے ایک سفید فام پادری دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے یک لخت خیال آیا کہ وہی ہے جس کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔ وہ خدا سے ہمارے گناہ بخشوانے گیا ہوا ہے۔ میرے قدم آپ ہی آپ اس کے پیچھے اٹھ رہے تھے۔ جیسے میں بھی کسی قبر ہی سے برآمد ہوا ہوں اور مجھے اسی کی رہبری میں کہیں پہنچنا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں میں اپنے آپ میں لوٹ آیا اور اسی دم وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔"

"شہر بھر میں۔" سبھوں نے ڈسٹرب ہو کر بولنے والے کی طرف دیکھا ہے جس سے اسے افسوس ہونے لگا ہے کہ اس نے اپنا منہ کیوں کھولا تاہم اس نے اپنی بات پوری کر دی ہے۔ "آپکے اس قبرستان کے بارے میں مشہور ہے کہ پورے چاند کی رات کو مردے قبروں سے باہر نکل آتے ہیں۔"

"آج بھی پورے چاند کی رات ہے۔"

گورنر اپنی خواہش پر قابو نہیں پا سکا ہے۔

"اگر تم لوگ چاہو تو آؤ ادھر کا ایک چکر کاٹ آئیں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

"آؤ گھبراؤ نہیں جو مر چکے ہیں وہ بے چارے قبروں سے باہر آ کے بھی ہمارا کیا بگاڑیں گے؟"

"مجھ سے چلا نہیں جاتا رام۔" اس کی بیوی نشے میں اٹھ نہیں پا رہی ہے۔ "وہ رضامند ہو جائیں تو انہیں کھانے کی دعوت دے کر یہیں لے آؤ۔"

گورنر کی سرکردگی میں وہ اپنی اس مہم پر لان کی پشت کی جانب ہو لئے ہیں۔ اس وسیع لان کے خاتمے پر ایک دیوار ہے اور دیوار کے دائیں کنارے پر ایک دروازہ جس سے گزر کر وہ قبرستان میں آ داخل ہوئے ہیں۔

قبرستان میں ایک طرف چند جھاڑیوں کے پیچھے شہر کے چند لوگ چھپ کر کھڑے سرگوشیاں کر رہے ہیں "اب تو یقین آ گیا سب افواہیں ہیں؟" ان میں سے ایک نے مسکرا کر کہا ہے۔

"دیکھ لو جوں کے توں اپنی قبروں میں سوئے پڑے ہیں۔"

"ہاں ابھی تک تو کوئی نہیں نکلا۔"

"چلو اب واپس شہر چلیں۔"

"ارے!......وہ دیکھو!......"

کسی نے ایکا ایکی جھاڑیوں کی دوسری جانب گورنر اور اس کے ساتھیوں کے جھلتے ہوئے سروں کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ سبھی چیخ چیخ کر سر پر پاؤں رکھ کے بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔

نامراد

پنڈت بڑا گھبرایا ہوا تھا اور پتہ نہیں، تھیلے کے بوجھ سے کانپ رہا تھا یا ضمیر کے۔ وہ گویا سڑک کی انجان بھیڑ میں نہیں چل رہا تھا بلکہ یہ سارا ہجوم اس کی تلاش میں آنکلا تھا۔ اور اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ پنڈت خجل سی فتح یابی سے مسکرانے لگا۔ بڑے شہروں کی چکاچوند کا یہی تو ایک فائدہ ہے کہ کچھ بھی کرلو، کسی کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا، اسلیئے جو بھی کرنا ہو، لوگ یہاں کھلے عام کرتے ہیں۔ چلتے چلتے کسی بھلی عورت سے ٹکرا گیئے ...... ''چھما کرنا بہن جی۔'' اور بہن جی کی خنداں آنکھیں پوچھنے لگیں ''کیوں؟ تم نے کیا ہی کیا ہے؟'' ...... 'تو پھر آؤ بہن جی، پہلے کچھ کرلیتا ہوں۔'' پنڈت ہنسنے لگا۔

کوئی پندرہ برس پہلے بھی وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں میں مندر کا پجاری تھا۔ ایک گہری رات کو وہ چھنو کا منہ پرشاد کے لڈوؤں سے بھرنے کے لئے اسے اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ سب تھک کر سوئے پڑے تھے۔ بس ایک بھگوان کی مورتی ہی جاگ رہی تھی۔ کیا مجال، کبھی جھوٹ موٹ ہی آنکھیں موند لے؟ شور مچا مچا کر سارے گاؤں کو جگا دیا اور پنڈت بے چارہ خواہ مخواہ پکڑا گیا۔

پنڈت نے تھیلا دائیں ہاتھ سے بائیں میں لے لیا اور ہڈیاں سہلانے لگا، مانو ابھی ابھی پندرہ برس پہلے کی مار کھا کے اٹھا ہو۔ کچھ بھی ہو مار کھا کے کیئے کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے، ورنہ کیئے جاؤ اور کلیجے کا بوجھ بڑھاتے جاؤ۔ پنڈت کا دل بوجھ ہی بوجھ سے اس کے حلق میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا کہ مل جائے تو پہلے پانی پی لے، مگر یہاں خالی پانی کہاں؟۔ وہ ایک بار ہے۔ کیوں بھائی پانی ملے گا؟۔۔ ارے! نا معلوم کیا کر کے آیا ہے کہ پانی مانگ رہا ہے۔ جاؤ بابا، چار ہی قدم پر تھانہ ہے، پانی ان سے مانگو۔ ہمارا تم نے کیا بگاڑا ہے؟ جاؤ!

لال پگڑی والے کو دیکھ کر پنڈت بے سبب بوکھلا جاتا تھا۔ گزشتہ منگل وار کا ذکر ہے

کہ سامنے کی چوکی کا حولدار وردی پہنے کھٹ کھٹ مندر میں چلا آیا۔ پنڈت اس وقت بھگوان کرشن کے منہ میں بھوجن ڈال رہا تھا۔ لال پگڑی کی جھلک پا کر اس نے کھانے کا تھال وہیں رکھ دیا اور باہر آ کھڑا ہوا۔

"جے سری کرشن، پنڈت جی۔"

"جے سری کرشن۔"

"کہیے ہمارا بھگوان کیسے ہے؟"

"بھگوان تو سدا مزے میں ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں دیکھ کر بتایئے؟ کہیں مزے سے بیٹھے بیٹھے اس کی آنت تو نہیں اکڑ گئی۔"

حوالدار کو اچانک خیال آیا کہ وہ تھانے میں پھنسے ہوئے کسی ساہوکار کا ذکر نہیں کر رہا ہے اور وہ سنبھل گیا۔ "کیا کریں پنڈت جی؟ چوبیس گھنٹے چوری، ٹھگی اور ڈکیتی کی رپورٹیں لکھ لکھ کر ہمیشہ الٹی باتیں ہی سوجھتی ہیں۔" اس نے پنڈت کے ہاتھوں میں منگل وار کے پرشاد کا لفافہ تھما دیا۔

پنڈت نے اطمینان کی سانس لی۔

"جے سری کرشن!۔ بنانے والے نے تو آدمی کو آدمی ہی بنایا، پر آدمی آپ ہی آدمی نہیں رہا، حوالدار جی۔"

حوالدار جوتے اتارنے لگا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں پنڈت جی۔ آپ سے کیا پردہ؟ کسی خونی کی ماں نے پانچ روپے رشوت دے دی تھی کہ مجھے اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھ لینے دو۔ پیسے تو میں اپنی سگی ماں سے بھی نہ چھوڑتا پر اسی دم سوچ لیا، ان برے پیسوں کو کسی اچھے کام میں ہی خرچ کروں گا۔ جے سری کرشن!"

حوالدار نے نل سے ہاتھ دھو کر انہیں کسی مجرم کی مانند چھاتی پر باندھ لیا اور پنڈت کے پیچھے پیچھے چل کر بھگوان کی مورتی کے سامنے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

پنڈت کو اپنا بازو بھاری معلوم ہونے لگا تو اس نے تھیلا پھر دائیں ہاتھ میں لے لیا۔

تمہاری مہما اپرم پار ہے بھگوان۔ قانون کی رکشا کرنے والے کے من میں شک پیدا ہوا یا قانون میں بگاڑ پیدا کرنے والے کے، تم سب کا پرشاد بے جھجک منہ سے لگائے ان کا منہ

بھی میٹھا کر دیتے ہو۔ اچھے اور برے سب چین کی بنسی بجاتے ہوئے تمہارے دوار سے لوٹتے ہیں۔ دھنیہ ہو!...... تھیلے کو کہنی کی طرف سرکا کے پنڈت نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑے، کرشن بھگوان کو پرنام کیا اور پرنام کرتے ہوئے ایک شرابی سے ٹکرا گیا۔ وہ بڑبڑا کر اس سے پوچھنے لگا۔ "پیے ہوئے ہو؟ بھری سڑک پر ہاتھ باندھ کے چلتے ہو۔ کم سے کم آنکھیں تو کھلی رکھو۔"

"مگر آنکھیں کھلنے پر ہاتھ کیسے باندھے گا؟"۔ شرابی کا ساتھی بھی لڑکھڑاتے ہوئے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ "ہاں، بڑی سمجھ کی بات کہی ہے۔ اسی بات پر ایک ایک جام اور چڑھا آتے ہیں...... آؤ!"

"ہاں، آؤ، اس تلک دھاری کو بھی ساتھ لے چلیں۔"

پنڈت ان سے جان چھڑا کر جلدی جلدی آگے ہولیا۔ وہ اپنے دوست مدن لعل کے ساتھ اکثر شراب پینے بیٹھ جاتا تھا۔ مدن کو تو سب کو دکھا کے پیتے ہوئے خوشی ہوتی تھی مگر وہ ہمیشہ چھپ کر ہی پیتا تھا۔ "اول تو برے کرم سے بچ کر رہو۔" وہ مدن لعل کو سمجھایا کرتا "مگر بچنا بس میں نہ رہے تو اتنا تو کرو کہ کسی کا من میلا نہ ہو۔"

"ہو بھی جائے تو کیا ہے؟ ہنستے کھیلتے اس کی ساری میل کو دھو دو۔"

مندر کا فلیٹ ایک بہت بڑی بلڈنگ کی چھٹی منزل پر تھا۔ ہر منزل پر ایک ایک بیڈ روم کے دو دو فلیٹ تھے۔ لیکن اس منزل پر ایک چھوٹا سا مندر تھا اور مندر کے اندر ہی کھلتا ہوا صرف پنڈت کا فلیٹ، بلڈنگ کے مالک سیٹھ مول چند کا کہنا تھا کہ بھگوان کرشن خود آپ بیکنٹھ سے چل کر اس کے سپنے میں آئے اور بولے، اپنی اس بلڈنگ کی چھٹی منزل پر میرا مندر بنوا دو۔ میں نے بہت کہا، میرے داتا آپ کا شاندار مندر الگ سے بنوائے دیتا ہوں۔ لیکن بھگوان اڑ گئے...... نہیں میرے بھگتوں کو اگر ان چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں رہنا ہوگا تو میں الگ سے اپنا محل کیوں بنواؤں...... سو جسے بھی کرائے پر فلیٹ دیتا ہوں اس سے حلفیہ بیان لے لیتا ہوں کہ وہ بھگوان کرشن کا بھگت ہے۔

"میں نے اس بیان پر بخوشی دستخط کر دئے۔" مدن لال نے پنڈت کو بتایا تھا۔ "اگر سیٹھ سچ بولتا ہے تو کرشن بھگوان بھی میری طرح مارکسِسٹ ہے۔"

مدن لال مندر ہی کی بلڈنگ کی دسویں منزل پر رہائش پذیر تھا۔ "تمہارے بھگوان

سے چار منزل اوپر رہتا ہوں پنڈت۔۔ مگر رہتا کہاں ہوں بس یہ مان کے چلو اپنی خباثتوں کے باعث لوٹتا پوٹتا رہتا ہوں اور تمہارے بھگوان کو ترس آجائے تو وہ آپ ہی کہہ دیتا ہے۔ جاؤ مدن لال، پنڈت کے ساتھ بیٹھ کے دو گھونٹ پی آؤ۔"

بھگوان کی آرتی کے بعد کافی رات گئے مدن ایک پورا اڈھالے کر پنڈت کے پاس آپہنچتا۔ پنڈت اس کے آتے ہی فلیٹ کی چٹخنی اندر سے چڑھالیتا اور پھر مدن کو سونے کے کمرے میں جانے کا اشارہ کر کے مندر کا دروازہ بند کرنے کے لئے بڑھتا۔ "دروازہ کیوں بند کرتے ہو؟" مدن لال اس سے کہتا۔ "وہ میرے ساتھ کئی بار پی چکا ہے۔"

ایسے ہی ایک موقع پر پنڈت میدان صاف کر کے مدن کے پیچھے اپنے سونے کے کمرے میں وارد ہوا تو وہ اسے بتانے لگا۔ "پرسوں جب تم یہاں اپنے بھگوان کی آرتی اتار رہے تھے پنڈت، تو وہ میرے پاس پہنچا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے ساتھ خوب ڈٹ کر پی اور جب پی کر بڑے گہرے ہوش میں آگیا تو ہمارے یگ کی ایک نئی مہابھارت کا اعلان کیا۔ اے ارجن کان کھول کر سنو۔ میں نے ہاتھ باندھ کر اسے بتایا کہ میں ارجن نہیں مدن لال ہوں۔ ہاں، تم ارجن کیوں کر ہو سکتے ہو۔؟ دھیان سے سنو! مدن لال۔!

پنڈت نے دونوں کانوں کے پٹ کھول رکھے تھے کہ من بھاتے کھانے پینے کی توقع ہو تو انوکھی باتیں بڑی بھلی لگتی ہیں۔

"جانتے ہو۔ بھگوان نے مجھے کیا بتایا؟ اس نے کہا۔ اے مدن لال! تمہارے یگ میں مہابھارت رن بھومی میں آمنے سامنے نہیں لڑی جائے گی۔ بلکہ اس یدھ کو ہر کسی نے ہر وقت مسکرا مسکرا کر محبت سے لڑنا ہے اور ہر کسی کا اسی طرح ناش کرنا ہے۔"

بھگوان کا کہا سن کر میرا نشہ ہرن ہو گیا۔

"بھگوان کے بارے میں الٹی سیدھی مت ہانکا کرو؟" پنڈت کو مدن کی باتوں سے مزا آرہا تھا مگر اس نے سوچا کہ وہ چڑا ہوا دکھائی دے گا تو بھگوان کی نظروں میں اس کی پوزیشن صاف رہے گی۔

"الٹی سیدھی؟ تمہارا ذہن تو الٹا نہیں پنڈت؟ بھگوان ایک تمہاری ہی جائیداد نہیں، وہ میرا بھی ہے اور میری خواہش ہے جو کچھ مجھے اچھا لگتا ہے اس سے میرا بھگوان بھی محروم نہ رہے۔"......وہ بوتل کا ڈھکنا کھول کر ہنسنے لگا۔ "جاؤ دروازہ کھول کر اسے بھی لے آؤ...... جاؤ!"

پنڈت نے ہونٹوں پر انگلی باندھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
"چلو کوئی بات نہیں۔ اگر اس کا موڈ ہو گا دروازہ کھلا ہو یا بند، وہ میرے تمہارے گلاس سے وہیں بیٹھے بیٹھے پی لے گا۔"
پنڈت ہنسنے لگا لیکن جھٹ ہی سنبھل کر اپنے اوپر غصہ طاری کرنے لگا کہ ہنس کیوں رہا ہوں۔
"میں مذاق نہیں کر رہا پنڈت! میں نے کئی بار یہیں اس کمرے میں اپنی دو آنکھوں سے دیکھا ہے کہ میرا گلاس بھرتے ہی اپنے آپ خالی ہو جاتا ہے۔ بولو وہ نہیں تو اور کون اسے خالی کرتا ہے۔"
کئی دفعہ مدن لال پنڈت کے ساتھ پینے کی بجائے پی کر ہی اس کے یہاں آتا اور سیدھا بھگوان کے چرنوں میں جا بیٹھتا۔
"مانا کہ میں برا ہوں بھگوان"...... وہ بھگوان کرشن سے مخاطب ہو کر کہتا "مگر جو بھی کرتا ہوں تمہاری ہی ذمہ داری کو نبھانے کے لئے کرتا ہوں۔ یہ ذمہ داری تمہاری ہے کہ میں زندہ رہوں۔ بولو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاؤں تو مجھے کہاں سے کھلاؤ گے؟ بانسری کو منھ سے ہٹا کر جواب دو برا نہ بنوں تو کھاؤں کیا؟ مجھے کوئی منتر پھونکنا نہیں آتا کہ نیکی ہی نیکی سے روٹیاں بنالوں...... نہیں، بانسری بجانا بند کرو اور بات کا جواب دو...... یا اپنے پنڈت کو اتنی بدھی دو کہ میری بات کا جواب دے سکے۔"
پنڈت کو قبول تھا کہ مدن لال کی باتوں کا جواب اس سے نہیں بن پڑتا۔
"تو پھر بھگوان کرشن کو چین کی بنسری بجانے دو اور تم ہمیشہ وہی کرو جو میں کہوں۔"
پنڈت کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ مدن لال کی باتوں میں آکر میں نے غلطی کی ہے۔ تھیلے کو ہاتھ پر لٹکائے رکھنے سے اس کا بازو اکڑ گیا تھا۔ اس نے اسے پیٹھ پر لٹکاتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ اب بھی واپس چلا جاؤں؟...... نہیں وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس نے اپنی کلائی کو آگے کر کے گھڑی پر سے ٹائم دیکھا۔ سوا نو بجنے کو آرہے ہیں ساڑھے نو بجے تک مجھے وہاں پہنچ ہی جانا چاہیے۔ وہ تیز تیز چلنے لگا اور ابھی تھوڑی ہی دیر چلا ہو گا کہ اپنے قدموں کی طرف دیکھ کر ٹھٹھک کے رہ گیا۔ پٹری پر سے بھگوان کرشن منہ سے بانسری ہٹائے بغیر اسے آواز دے رہے تھے۔ پنڈت!...... ہو بہو وہی صورت۔ وہی پہناوا وہی!......

بوکھلاہٹ میں پنڈت نے تھیلے کو کندھے پر سے گرنے سے بڑی مشکل سے روکا اور پھر پٹری پر کھینچی ہوئی رنگولی کو گھورتا رہا۔ بھگوان کے وجود پر اور اس کے آس پاس پانچ پانچ دس دس پیسے کے سکے پڑے تھے۔ اس کا ہاتھ لاشعوری طور پر اپنی جیب میں چلا گیا جہاں ایک چونی اور دو چار چھوٹے بڑے نوٹ رکھے تھے، چونی کھوٹی تھی مگر پنڈت اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ سکہ کھوٹا ہو یا کھرا۔ جس کے پاس پہنچ جائے اسے لگانا ہی ہوتا ہے۔ اس نے بڑی تعظیم سے چونی، بھگوان کے قدموں میں پھینک دی اور وہاں سے پانچ پانچ پیسے کے تین سکے اٹھانے کے لئے جھک گیا۔ پانچ پیسے مجھے دینا ہی تھے اور اوپر کے پانچ پیسے اس لئے کہ چونی کھوٹی ہے۔ مگر بھگوان کرشن کی رنگولی سے تین سکے اٹھانے کے بعد اس نے جلدی سے چوتھا بھی اٹھالیا۔ میرے مندر میں جس نے یہ چونی پھینکی ہوگی، کیا پتہ وہ اسے لگانے کے لئے ہی لایا ہو اور اپنے پانچوں پانچ پیسے لے اڑا ہو...... ارے......! میرا سارا وقت یہیں نکلا جارہا ہے۔ وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے...... وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا اور جب اس کے قدموں میں آہنگ پیدا ہو گیا تو اس کے خیالات کی بے آہنگی اس آہنگ میں سمٹنے لگی۔

مدن لال ٹھیک ہی کہتا ہے، جب ساری دنیا سڑکوں پر اتر آئی ہے تو بھگوان بھی اندر پڑے پڑے چڑھاوے کی برفی کھا کھا کر اپنا خون کیوں میٹھا کرتا رہے؟ وہ بھی پٹریوں پر کیوں نہ رہائش اختیار کر لے؟ سیٹھ مول چند کا محتاج کیوں بنا رہے؟...... کیوں؟

مدن لال پنڈت کو صرف شراب ہی نہ پلاتا تھا بلکہ سیاسی لیڈروں کی تقریریں سنانے کے لئے بھی لے جایا کرتا تھا۔ اس وقت پنڈت کو محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے اندر ایک بہت بڑے میدان میں وہ آپ ہی ہزاروں کی تعداد میں بیٹھا ہے اور اپنے آپ کو بڑے دھیان سے سن رہا ہے۔ کیوں؟ اس کا خیال دراصل اس نشیب پر بہہ نکلا تھا کہ سیٹھ مول چند نے اس کی تنخواہ کیوں بند کر دی۔ بیس لوگ بھگوان کے درشن کو آئیں تو بڑی مشکل سے ایک روپے کا چڑھاوا جمع ہوتا ہے۔ بھگوان کا سیوادار بننے کا کیا یہی معاوضہ ہے؟...... ''اے ارجن کام کر، اور پھل کی ابھلاشا مت رکھ!'' ...... مگر تھوڑی بہت تو......

''پنڈت جی۔'' ...... سیٹھ مول چند نے اس سے کہا تھا'' بھگت یہاں پیسے ہی نہیں چڑھاتے بلکہ پھل، اناج اور بھانت بانت کے پکوان بھی ڈال جاتے ہیں۔ فلیٹ آپ کو مفت میں ہی ملا ہوا ہے آپ کو اور کیا چاہیے؟''

"تمہارا سر"

مگر اس نے گھگیا کر جواب دیا تھا۔

"کچھ نہیں، ان داتا!"

"پنڈت جی، آپ بھگوان کے نوکر ہیں۔ سو وہ آپ ہی روز کے روز آپ کی تنخواہ کا پربندھ کر دیتا ہے۔ میں کون ہوتا ہوں جو آپ کی تنخواہ دینے کا دعویٰ دار بنوں؟"

"میں آپ کا بھی بے دام نوکر ہوں ان داتا۔"

بھگوان کو بھی اپنا نوکر بنائے ہوئے ہے۔ دشٹ کا بھلا کیسے ہوگا؟ بھلا تو تمہارا بھی کیسے ہوگا؟...... پنڈت نے اپنے آپ سے پوچھا...... ہاں میں خواہ مخواہ مدن لال کے چکر میں پھنس گیا۔ جو کام کرنے جارہا ہوں۔ اس کے خیال سے بھی ڈر لگتا ہے۔ مگر مدن لال کہتا ہے، تم بے وجہ ڈر رہے ہو پنڈت، بھگوان کا اپدیش یاد رکھو۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے میری مرضی سے ہی ہوتا ہے، اُسے میں ہی کرتا ہوں۔ سو پنڈت، میرے بھائی! تم کون اور میں کون؟ ہمارا کام وہی کیئے جانا ہے جو ہم کرتے ہیں۔ بے فکری سے اپنا کام پورا کرو۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ فائدہ تو سارا ہی اس کا ہے۔ کل ہزار روپے ملیں گے جس میں ڈھائی سو اس کا حصہ ہے اور...... اور "دیکھو پنڈت" مدن لال کی بیوی نے اسے دھمکی دی تھی۔ "دو چار سیڑھیاں چڑھ کے خالی ہاتھ آجاتے ہو، شرم نہیں آتی۔ اگلی بار آؤ تو میرے لئے سونے کا نکلس لے کے آؤ، نہیں تو شور مچا کر پٹوا دوں گی"...... چیز ہی ایسی ہے ورنہ کون منہ لگائے؟...... مگر شاید ان دونوں نے مل کر ہی یہ جال بچھایا ہو...... مدن لال کو خبر ہوگی کہ میں اس کی بیوی ...... نہیں، ایسے نہیں ہو سکتا۔ مدن لال شریف آدمی ہے...... مگر شریف آدمی تو میں بھی ہوں......

پنڈت کو یکبارگی اپنے پیچھے سے چور چور کی صدائیں سنائی دیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کے عین عقب میں چند لوگ ایک آدمی کے پیچھے پیچھے دوڑے آرہے ہیں۔ اسے نجانے کیا سوجھی کہ اس نے چور کے آگے آگے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا اور تھیلے کے بوجھ کے باوجود آناً فاناً سب کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

پنڈت نے جب دوڑنا بند کیا تو اپنے آپ کو ایک بڑے اعلیٰ درجے کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑے پایا اور دم لینے کے لئے تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے آپ سے پوچھتا

رہا کہ میں نے کس کی چوری کی ہے۔ اگر پکڑا جاتا تو بے سبب شامت آجاتی...... وہ خیال ہی خیال میں پٹتا رہا اور گھبرا گھبرا کر مسکراتا رہا۔ جہاں لوگ چور کو پکڑنے کے لئے آگے آگے بھاگ رہے ہوں وہاں وہ دراصل آپ ہی اپنے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ اتنے فاصلے پر رکھتے ہیں کہ اپنے قابو میں نہ آپائیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے پیچھے واقعی کوئی نہ ہو اور میں کان بجتے ہی دوڑ کھڑا ہوا؟

پنڈت نے جی ہی جی میں قہقہہ لگایا اور سامنے گیسٹ ہاؤس کا بورڈ پڑھنے لگا...... دا گریٹ گیسٹ ہاؤس ...... ہاں...... مجھے یہیں تو آنا تھا...... مگر اندر جاؤں یا لوٹ جاؤں؟ وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ جس کام کے لئے آیا ہوں اسے کردوں یا کئے بغیر واپس ہو لوں ...... یونہی لوٹنا تھا تو آئے کیوں؟...... تم پنڈتوں کی سدا یہی مصیبت رہی ہے ...... مدن لال اس سے کہا کرتا تھا...... سچ بھی بولنا چاہتے ہو تو بڑے جھوٹے دل سے!۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے گریٹ گیسٹ ہاؤس سے مدن لال برآمد ہوتے ہوئے نظر آیا۔

"ارے پنڈت!" مدن لال نے اسے مخاطب کر کے کہا "ہم اندر تمہارے انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو؟ چلو، صاحب خفا ہیں کہ تم ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔"

پنڈت اور مدن لال تیز تیز چل کر گیسٹ ہاؤس کے ایک دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ مدن لال نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ "کون ہے؟ آجاؤ۔"

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو سامنے صوفے پر بیٹھا ایک یورپی اپنے پائپ کے دھوئیں کو آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے بے صبری سے پنڈت کی طرف دیکھنے لگا۔

"لے آئے؟"

"ہاں"

پنڈت نے تھیلے سے اپنے مندر کے بھگوان کو نکال کر یورپی کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"مائی گاڈ! یہ تو سچ مچ کا گاڈ ہے۔" یورپی مورتی کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھول رہا تھا۔ "پکے پتھر کا انگ انگ نور اور حسن اور زندگی میں رچ بس گیا ہے۔"

اس نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ سو سو کے دس نوٹ گنے اور انہیں پنڈت کی طرف بڑھا

کر کہا۔

"یہ لو تمہارے گاڈ کی قیمت! گن لو!"

پنڈت نے نوٹوں کو گنے بغیر جلدی جلدی اندر جیب میں ٹھونس لیا۔

"ایک بات بتاؤ۔" ...... یورپی اس سے پوچھنے لگا...... "اپنا گاڈ تو تم نے بیچ دیا۔ اب تمہاری مرادیں کون پوری کرے گا؟"

اس کی بجائے مدن لال نے ہنس کر جواب دیا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں صاحب ہم سب لوگ اپنے نقلی گاڈ کا دیا ہی کھاتے ہیں۔"

سانس سمندر

نہیں، بلو، میری عمر تو ایک اسی دن پر اٹک کر رہ گئی جب میں یہاں سے نکل پڑا۔ اس کے بعد جینا ہی کہاں ملا؟

تو پھر اتنے بڈھے اور بھیانک کیسے نکل آئے ہو، بھالو کے بچے؟

دیکھو مجھے کچھ بھی کہہ لو، مگر بھالو کہو گے تو سر پھوڑ دوں گا (ہنس کر کرسی اس کے قریب سرکالیتا ہے)

ابھی تک ویسے ہی اپنے اصل نام پر چڑ جاتے ہو شیخ محمد اکرام۔ ہہ ہاہہ!...... بوڑھے ہوگئے ہو پر بڑے نہیں ہو پائے۔

ہاں یار، یہی تو کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی تک وہیں کا وہیں اٹکا ہوا ہوں۔ ذرا بھی بڑا نہیں ہو پایا۔ (وقفہ) بڑے تو ہم گھر کے اندر ہی ہو پاتے ہیں۔ بے گھروں کو بھی کبھی بڑا ہوتے دیکھا ہے؟

گھر کیا ہوتا ہے بھالو؟ جس چھت تلے بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہے ہوں، وہی گھر!......

نہیں، بلوا، تمہیں کیا پتہ؟ گھر وہاں ہوتا ہے جہاں پاس پڑوس میں ہی باپ دادا کی قبریں ہوں اور ان کا فاتحہ پڑھنے کے لئے انہی کی رفاقت میں پہلے ہم کشاں کشاں اپنی گلی کے نکڑ پر جا پہنچیں اور پھر نکڑ سے ایک آدھ فرلانگ کے کچے راستے پر ہی قبرستان میں...... (وقفہ)

رونے کیوں لگے ہو؟ سوائے تمہارے میں نے کبھی کسی بھالو کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ تم ہندوؤں کو ہی مار پیٹ کر پاکستان بھیج دیا جاتا۔ تم اپنے بڑوں کو جلا

پھونک دیتے ہو، سو جہاں چاہو ہو لو، ہم اپنے مرحوم باپ دادا کو سوتے میں چھوڑ کر کیوں نکل پڑے؟

فکر مت کرو۔ تمہارے بزرگ ابھی تک ویسے ہی بڑے چین سے سوئے پڑے ہیں۔

جھوٹ مت بولو، بلوا۔ بھابی تو کل بتا رہی تھیں کہ قبرستان کے بیچوں بیچ ایک سنیما کھڑا کر لیا گیا ہے۔

تو کیا ہوا بھالو۔ تنہائی میں دادا جان کا جی گھبرا اٹھتا ہو گا اور وہ گیٹ کیپر کو دِکھے بغیر بڑی شان سے ڈی لکس کلاس میں مفت آ بیٹھتے ہوں گے۔

میں کئی بار سوچتا ہوں، اچھا ہی ہوا۔ تم کافروں سے نجات تو ملی۔ (ڈھیلا ہو کر سامنے میز پر چائے کے پیالی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے) گناہوں کی لت پڑ جائے تو آدمی مڑ مڑ کے دوزخ کی طرف ہی دیکھتا ہے۔

تمہاری پیالی خالی ہے۔ ٹھہرو، میں اور چائے انڈیلتا ہوں۔ (اس کی پیالی بھرتے ہوئے) جی بھر کے پیو۔ پاکستان میں تمہیں اتنی اچھی چائے کہاں ملتی ہو گی...... سنو، باہر بے موسم بادل گرج رہے ہیں۔

یاد ہے بلو؟ ایک دفعہ جب ہم کالج ٹک شاپ کی دو ماہ کی چائے کا بل ادا نہ کر پائے تو ٹھیکیدار نے پرنسپل سے شکایت کر دی......

ہاں، بخوبی یاد ہے...... پرنسپل نے ہمیں تیس تیس روپے جرمانہ کر دیا۔ تم فریاد کرنے لگے، سر ہمارے پاس جرمانے کے پیسے ہوتے تو ہم چائے کا بل ہی کیوں نہ ادا کر دیتے؟ ہہ ہا ہہ!...... ارے، سموسہ بھی کھاؤ۔ کتنی دیر سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہہ رہا ہے، مجھے منہ میں ٹھونس لو۔ (پلیٹ سے ایک سموسہ اٹھا کر اپنے منہ کی طرف لے جاتا ہے۔)

کھانے کو مجھ سے کہہ رہے ہو بھیڑیے، اور منہ اپنا کھول رکھا ہے۔

تو کیا ہوا؟ ایک تم بھی اٹھا لو۔ اسے تمہارے منہ سے کھا لوں گا...... لو، کھاؤ!...... تم لوگ تو گوشت کے سوا کچھ کھاتے ہی نہیں...... اچھا، تو پھر یوں کرتے ہیں، جتنے دن یہاں ہو، کھانے کے اوقات میں فلائی کر کے اپنے پاکستان ہو آیا کرو۔

نہیں، میں......

میں میں کیا؟ بکرے کھا کھا کے بکرا ہی بن گئے ہو۔

نہیں، بابا، میں پکا وجیٹیرین ہو چکا ہوں۔

پکا وجیٹیرین!...... ہہ ہا!...... پکے فراڈ ہو! میری بہن شیلی بھی یہی کہا کرتی تھی کہ تم پکے وجیٹیرین ہو گئے ہو۔ تم دونوں کا افیئر شروع ہونے کے بعد میں اسے رحمت بی کہہ کے پکارنے لگا تھا...... کہاں ہے وہ؟ اس مانند پوچھ رہے ہو جیسے اچانک خیال آنے پر...... شیلی آج کل ممبئی میں رہتی ہے...... اور کس کے ساتھ؟ اپنے شوہر اور ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ، جو اس سے بھی بڑے ہو چکے ہیں اور وہ خود آپ، اتنی موٹی جتنے تم بوڑھے......

کیا بک رہے ہو؟

وہی جو سن رہے ہو۔ کوئی بوڑھا ہو کے بوڑھا ہو جاتا ہے اور کوئی بوڑھا ہو کے موٹا۔ رحمت بی اتنی موٹی ہو گئی ہے کہ اس کے ساتھ لگ کے کھڑے ہو جاؤ گے تو کہیں نظر بھی نہ آؤ گے۔ تمہاری گھگیائی آواز سن کر وہ یہی سوچے گی کہ تم کہیں پاکستان میں بول رہے ہو اور ذرا سی خوش ہو کے سر جھٹک کر پھر اپنے کام میں لگ جائے گی......

شیلی موٹاپے کا کوئی علاج کیوں نہیں کرتی؟

تم اپنے بڑھاپے کا کوئی علاج کیوں نہیں کرتے؟ شکر کرو تمہارے پاس ممبئی کا ویزا نہیں، وگرنہ اس کا شوہر (ہاتھوں کو لمبائی اور چوڑائی میں پھیلا کر) اتنا بگڑا اور تعصبی سکھ سردار ہے اور ابھی تک جنسی شدت سے نفرت کر پانے کا اہل۔

اچھا؟!...... مجھے شیلی کی فیملی کی ساری تفصیلات بتاؤ۔

چھوڑو یار، تم مسلمان عشق کرنے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ نامعلوم اپنا پاکستان کیسے چلا رہے ہو...... باہر بادل کی گرج بڑھ گئی ہے۔ پانی برسے گا۔

تم جو ہندوستان چلانے کا اتنا جتن کر رہے ہو، بتاؤ، کیا وہ پچاس پچپن کا ہو کے بھی چلنا سیکھ گیا ہے؟...... تمہارا سموسہ واقعی بہت لذیذ ہے بلو۔

بنگو حلوائی کا ہے۔ بڑا پہنچا ہوا حلوائی ہے۔ تقسیم پر جیسے تم وہاں چلے گئے وہ بھٹک کر اپنی دیہ وہاں سے یہاں تروینی کے کنارے اٹھا لایا۔ کہتا ہے، پتہ نہیں بچے موت پر میرے پھول یہاں لاتے یاد ہیں کسی نالے میں پھینک دیتے، سو اچھا ہے میں آپ ہی اپنے آپ کو یہاں اٹھا لایا ہوں...... بنگو خالص پنجابڑا ہے مگر اس کے بچے یہاں اتنی شدھ ہندی میں سدھ گئے ہیں کہ بے چارہ انہیں بالکل سمجھ نہیں پاتا...... تمہارے بچے کیا تمہاری زبان سمجھ لیتے ہیں بھالو؟

میرا ایک لڑکا ڈاکٹر اشرف میرے ساتھ رہتا ہے، ایک امریکہ میں مقیم ہے اور ایک لڑکی انگلینڈ میں۔ تینوں میری زبان نہیں سمجھتے۔ ان سے میں ہمیشہ اپنی زبان کے انگریزی ترجمے میں بات کرتا ہوں۔

مگر تمہاری انگریزی تو نہایت کمزور تھی...... ہہ ہاہہ!...... بوندا باندی شروع ہو گئی ہے...... پتہ ہے بھالو، کیا؟...... اپنے بچوں سے بات کرتے ہوئے میں بھی اپنی اردو ہندی میں بولنے لگتا ہوں، حالانکہ ہندی سے نابلد ہوں۔

اور کیا اردو سے نہیں؟

ہہ ہاہہ!...... کچھ بھی کہہ لو، یارم، بات تمہاری غلط نہیں۔ یہاں سیاسی پارٹیاں اردو کے حق میں یا خلاف کچھ ایسے بیان دیتی رہتی ہیں مانو یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہو۔ اب تو یہ صورتِ حال ہے کہ دل کی کوئی چھوٹی سی بات کرتے ہوئے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اسلام کی تبلیغ کر رہا ہوں۔

یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اسی طرح شاید کبھی راہِ راست قبول کر لو۔

اور راہِ راست پر چل کے سیدھا پاکستان آ پہنچوں۔

کبھی بھول کر بھی آ پہنچو تو کیا کہنے؟ ادھر میں ہی تمہاری جانب آنکھیں باندھے رکھتا ہوں۔ اپنا آس پاس مجھے دکھتا ہی نہیں ایک اپنا یہ الہ آباد ہی آنکھوں میں بسا رہتا ہے۔

بڑے خوش قسمت ہو بھالو، کہ کچھ تو آنکھوں میں بسائے ہوئے ہو۔ میں تو صرف وہی دیکھ پاتا ہوں جو عین اُس وقت دکھ رہا ہو...... بارش بڑھ رہی ہے...... تم واقعی خوش قسمت ہو، ورنہ الہ آباد کی جن گندی گلیوں میں مَیں بدک بدک کر چلتا ہوں، اپنے ذہن میں اُنہی میں چلتے ہوئے تمہاری ناک میں خوشبوؤں کی پوٹلی کیوں کھل جاتی ہے؟...... ارے، پھر سے رونی صورت بنالی ہے!......

تم کافروں نے ہمیں بیٹھے بٹھائے اپنی جنت سے نکال دیا۔ میں رہتا وہاں ہوں بلو، مگر جیتا یہاں الہ آباد میں ہوں۔

نہیں، تم وہیں رہتے ہو اور وہیں جیتے ہو۔ روؤمت! ہر کھیل میں اپنا چھوٹا سا رونا مار کر بازی مار لیا کرتے تھے۔

میں تو اپنی ہر بازی ہار چکا ہوں بلو!۔

ہار بھی چکے ہو تو کیا ہوا؟ کم سے کم ہر بازی کھیل تو لی۔

کھیلی بھی کہاں؟ میری زندگی تو وہیں اٹک کر رہ گئی جہاں کوئی بازی ابھی شروع بھی نہ ہوئی تھی۔

نہیں، جیسے بھی کھیلا گیے، زندگی کی بازی تو ناگزیر طور پر اپنے انجام پر آ پہنچی۔

(وقفہ)

(سگریٹ سلگا کر) لو، بھالو، تم بھی پیو...... نہیں؟...... کیوں، تم تو خواب میں بھی منہ سے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے رہتے تھے؟

ڈاکٹر کہتا ہے، جان بچائے رکھنا ہے تو سگریٹ چھوؤ بھی نہیں۔

مت چھوؤ...... (سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر) زندگی کی سب سے بڑی ترغیب یہی ہے کہ جان کو بہر حال بچالیا جائے...... خواہ محض سگریٹ پینے سے خود کو روک کر، اور خواہ فسادات میں گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لے کر۔ (ایک اور لمبا کش لیتا ہے) دیکھو، باہر موسلادھار بارش ہونے لگی ہے۔

وہ دن تمہیں یاد ہیں بلو؟ الہ آباد میں فسادات ابھی شروع نہ ہوئے تھے مگر ایک کھٹکا سا لگا رہتا تھا، اور پھر اس روز ہم اسی گھر کے پچھواڑے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں نے بال کو اتنے زور سے ہٹ کیا تھا کہ تمہارے ہاتھ کیچ کا پیالہ بنائے رہ گئے اور بال اوجھل ہو کر جانے کہاں جا گرا۔ اسی اثنا میں میرے بھائی جان دوڑتے ہوئے وارد ہوئے...... چلو!...... چلو!......

چھوڑو، یہ قصہ تم کئی بار اپنے خطوں میں دہرا چکے ہو...... تمہارے بھائی جان تمہیں بازو سے کھینچ کر گھر سے باہر گلی کے کنارے لے آئے جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی...... چلو!...... گاڑی میں قدم رکھتے ہی تم نے کیا دیکھا کہ بھابی تمہاری ہچکیاں لے لے کر ننھے پپو کو گود میں چپ کروا رہی ہے اور پپو کا بڑا بھائی جمی بھی بھابی کے پہلو میں سہم کر بیٹھا ہوا ہے۔

ہاں، میں نے چیخ کر پوچھا، ہوا کیا ہے؟...... بلوائیوں نے ہمارے گھر کو آگ لگا دی ہے!...... آگ بجھی نہیں؟...... اب کیا بجھے گی؟...... ہماری گاڑی ہوا میں اڑ رہی تھی بلو اور میرے ابو، امی، دادا جان، دادی اماں۔ سب کے سب اپنی قبروں سے بر آمد ہو کر بے پر ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے...... او ظالمو، او ہمیں کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہو؟...... او ہمیں بھی اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤ!......

رولو...... رولو! (اس کا ہاتھ بڑی ملائمت سے اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے) سکھوں میں دکھ یاد کر کے آدمی اجلا نکل آتا ہے۔

نہیں، یار! تم کہتے ہو جان بچا لینا ہی زندگی کی سب سے بڑی ترغیب ہے، مگر جان بچا کر جینا بھی تو ملے۔

ملا! اسی لئے تو سانس لے رہے ہو، اسی لئے نیا گھر بار بنا لیا ہے، بچے پیدا کر لئے ہیں اور جینا بھوگ کر بوڑھے ہو لئے ہو...... ہاں، میرے بھائی، مرتے دم تک ہر سانس پر بے اختیار سانس لئے بغیر بن نہیں پڑتی۔ (ٹیلیفون کی گھنٹی سن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے)......

ہیلو! ہیلو!...... بھابی!...... ہاں، اکرام میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ ہاں، ابھی آ رہا ہے...... لو، بھابی کراچی سے بلا رہی ہیں۔

ہیلو، فاطمہ!...... کیا؟!...... او۔ نو!...... اشرف کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟...... اسپتال میں ہے! گھبراؤ نہیں، میں آج ہی شام کے فلائیٹ سے پہنچ رہا ہوں۔ نہیں، میں یہاں کیا کروں گا؟...... اللہ حافظ!......

کیوں، کیا ہوا؟

اشرف کی ڈسپنسری کے باہر بم پھٹا ہے۔ اشرف بھی زخمی ہو گیا ہے۔

ہاؤ سیڈ! (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دباتا ہے)

میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں بلو۔ ہو سکے تو اِسی وقت۔

ہاں، ضرور!......

(او ظالما، ہم سے ملے بغیر ہی جا رہا ہے؟)

...... ضرور!

(باہر مطلع یک بہ یک صاف ہو گیا ہے مگر بارش بدستور ہو رہی ہے)

کٹھ پتلیاں

کٹھ پتلی والے کا بیٹا پہاڑوں سے نیچے اترتے ہوئے کچے راستے پر اس طرح جھول جھول کر چل رہا تھا جیسے کوئی اس کے کپڑوں میں نیچے سے انگلیاں ڈال کر کٹھ پتلی کو چلائے جا رہا ہو۔ اس کے بائیں کندھے سے کمر کی دائیں طرف ایک میلا سا تھیلا لٹک رہا تھا۔ جس میں دو کٹھ پتلیاں اور ان کا سارا سامان رکھا ہوا تھا۔ ''کئی بار کہا ہے'' کٹھ پتلی والے کے بیٹے کو غصہ آنے لگا تھا۔ ''گھر سے نکلتے وقت اتنا بوجھ نہ اٹھوایا کرو۔''

بے خیالی میں اسے ٹھوکر سی لگی تو تھیلے سے ایک پتلی دوسرے سے ٹکرا کر بج اٹھی۔'

''تمہارا دادا تو ہمارے لیے ان سے بھی دگنے کپڑے اٹھائے پھرتا تھا''

''میں اپنا دادا نہیں ہوں'' وہ اپنے باپ کو دادا ہی کہا کرتا تھا۔

''مگر اسی نے تمہیں پیدا کیا تو تم کٹھ پتلی والے کے بیٹے بنے'' اس کے خاندان کے ہر کٹھ پتلی والے کو لوگ کٹھ پتلی والے کا بیٹا ہی کہتے آئے تھے۔ وہ اکثر سوچا کرتا خود آپ کٹھ پتلی والا کون ہو گا۔۔؟ وہ مسکرانے لگا۔۔اوپر والے کے سوا اور کون؟

پتلی نا معلوم اسے کیا بتا رہی تھی کہ اس نے اسے ٹوک دیا ''اچھا، اب باتیں مت بناؤ۔ جو ساتھ لے آئے سو لے آئے''

''کیا لے آئے؟ میری وہ بنارسی ساڑی تھوڑا ہی لائے ہو؟ میں نے تو ایک اسی کو ساتھ رکھنے کو کہا تھا۔''

''اچھا بابا، اِتنی باتیں کیوں بنائے جا رہی ہو؟۔۔ سو جاؤ۔۔۔ وادی تک ابھی پورا ایک گھنٹہ اور لگے گا'' وہ اچانک کچھ یاد آنے پر رک گیا ''پتہ نہیں میں نے دروازے پر تالا لگایا یا بھول گیا۔''

''لگا بھی آتے تو کیا؟ جھونپڑے کی چاروں دیواریں تو ٹوٹی ہوئی ہیں''

"میری تو حسرت ہی رہ گئی ہے" دوسری پتلی بولی "کبھی ہمارے گھر بھی کوئی چور گھس آئے"

"ہاں کوئی آ بھی گیا تو کیا لے جائے گا؟" کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے پھر اپنے قدم اٹھا لئے اور سامنے بار بار مڑتے ہوئے راستے کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ پہاڑوں میں گھری ہوئی زندگی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ بار بار مڑے بغیر سلامتی سے کہیں پہنچنا ہی نہیں ہوتا۔

بے خیالی میں چلتے ہوئے اس موڑ کی طرف اس کا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ کنارے سے وہ چار انچ ہی ادھر رہ گیا تھا۔ اس کی سانس خارج ہو کر باہر سے اندر لوٹنے کی بجائے اندر ہی اندر چلنے لگی۔ سراسیمگی میں اس نے آنکھیں گھما کر سامنے کے پہاڑوں پر پھیلا دیں جہاں ایک بوڑھا بندر اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے انتظار کر رہا تھا کہ وہ بے خبری میں کیونکر نیچے جا لڑھکتا ہے۔

کٹھ پتلی والے کا بیٹا ابھی اپنی راہ پر ہو لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے بادل کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے آپ کو بتانے لگا کہ بس اسی طرح ہنستا کھیلتا رہا تو اس کے برسنے سے پہلے ہی میں وادی میں جا پہنچوں گا۔ اس نے ایک دم لمبے ڈگ بھرنا شروع کر دیا۔ مگر ذرا سے میں ہی بادل کا قہقہہ سن کر رک گیا اور اپنا سر بالائی پشت پر پھیر لیا۔ لیکن اسی دوران بادل اس کے آگے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "بھیگنے سے بھاگنا چاہتے ہو؟"

کٹھ پتلی والے کا بیٹا رک کر مسکرانے لگا۔

"ہمیں اپنی پتلیوں کا ناچ نہیں دکھاؤ گے؟"

"کون سا ناچ؟"

کٹھ پتلی والے کے بیٹوں کے سبھی کھیل بادلوں کو از بر تھے۔

"ہاں اور نہ کا ناچ" بادل کے سائے میں ہلکی پھلکی دھوپ گھلنے ملنے لگی جس سے وہ سبک اور گلابی ہو گیا۔

اور کٹھ پتلی والے کا بیٹا بھی!

اور پھر وہ سب کچھ بھول کر بیٹھ گیا اور کندھے سے تھیلا اتار کر اس میں سے اپنی دونوں پتلیوں کو نکال لیا۔ وہ سو گئی تھیں اور اس کے ہاتھوں میں ابھی تک جوں کی توں سوئی پڑی تھیں۔ جب وہ انہیں گھٹنوں میں چھپا کر کپڑے پہنانے لگا تو ایک کوئی خواب دیکھتے

ہوئے ہنس دی اور دوسری نے سوتے میں ہی آنکھیں کھول لیں اور اس کی طرف دیکھ کر پھر بند کر لیں۔

لکڑی کے جسم کی یہی مصیبت ہے۔ جلنا نہ ہو تو سویا پڑا رہتا ہے۔ وہ ایک پتلی کے ہونٹوں پر مونچھ چپکا کر ہنسنے لگا۔ باہر کتنا بھی کیوں نہ بدل دو، بھیتر تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ اتنی بڑی بڑی مونچھیں رکھ کر بھی ادھر بلی نے کھٹکا کیا ادھر ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔ ''اری اٹھو۔۔'' اس نے مونچھ کا ایک کونہ پکڑ کر پتلی کو جگانا چاہا مگر رک گیا۔ کوئی بات نہیں۔ جب تک انہیں تیار کرتا ہوں دونوں آپ ہی جاگ پڑیں گے۔ اب وہ دوسری پتلی کو چولی پہنا رہا تھا۔ عجیب جاندار ہیں۔ اپنے آپ میں عورت ہیں نہ مرد۔ سو رہی ہوں تو جو چاہو بنا لو، اور جاگ رہی ہوں تو لڑ لڑ کر پاگل کیے دیتی ہیں۔ اس بار میں عورت بنوں گی۔۔ نہیں میں۔ نہیں!...... اری کیا عورت کیا مرد۔ جیسے بھی بنانے والے کے ہاتھوں میں بنتی ہو، بنتی چلی جاؤ۔ بادل کٹھ پتلی والے کے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

''کٹھ پتلی والے کے بیٹوں کا جواب نہیں!''

''کوئی سوال ہو تو جواب بھی بنے۔'' کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے سر اٹھا کر بادل کی طرف دیکھنا چاہا مگر پتلی کو چولی پہنا کر وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''میری کالی کی طرح اتنی سندر نکلی آئی ہو! جی چاہتا ہے تمہارے مردوا کو توڑ پھوڑ کر آپ ہی تم پر قبضہ جما لوں۔۔ کیوں رے مونچھوں والے، بولو۔۔ اٹھو!۔۔۔ دونوں پتلیوں نے آنکھیں کھول لیں۔۔ ''ہم سو تھوڑا ہی رہے ہیں''

عین اس وقت پتلی والے کے بیٹے کے پاس ایک پکا ہوا سیب لڑھک آیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر وہی بوڑھا بندر کھڑا کھی کھی کر رہا تھا۔

بندر کا بندر! ابھی ابھی مجھے آنکھوں سے دھکے دے کر پہاڑ سے گرا رہا تھا اور اب سیب لے کے آ گیا ہے۔ کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے سیب اٹھا لیا تو اسے بھوک کا احساس ہونے لگا اور اس نے پتلیاں بھول کر سیب پر دانت گاڑ لیے اور اس وقت تک گرد و پیش سے غافل رہا جب تک اسے ساری مٹھاس اور بیج سمیت اپنے پیٹ میں نہ اتار لیا۔ ذرا دور بندر بھی اس کی نقل اتارتے ہوئے سیب کھائے جا رہا تھا اور پتلیاں ان دونوں کا انبساط و انہماک محسوس کر کے فرط مسرت سے ناچنے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔

آخر انہیں نچانے والا بندر کو قریب آنے کا اشارہ کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ہوا میں باجا بجانے کے انداز میں ہلا ہلا کر، نیچے سے پتلیوں کے کپڑوں میں ڈال کر اپنی جگہ خوب اچھی طرح ٹھہر الیا اور ابھی انہیں نچانا شروع بھی نہ کیا تھا کہ خنک ہوا باجے کے سروں میں تپنے لگی۔ وہ پتلی سرعت سے ناچتی ہوئی ادھر آگئی اور پھولوں کی کیاری کا سار وپ دھارے نہ کی سمتوں میں سر جھولنے لگی۔۔۔۔ اور وہ دیوانہ اس کے ارد گرد رقص کرنے لگا۔ سنو تو...... نہ! سنو، ڈرو نہیں!...... ابھی نہیں!...... پھولوں کی کیاری اپنے مسرت آگیں خوف سے اونچی ہوتی جارہی تھیں اور بھونرا اپنی خواہش کی لپک سے!...... ابھی نہیں!...... تو پھر کب؟...... کبھی نہیں!...... میری بات سنو!......

اور جب پتلیوں کا یہ اندھا بہرہ ناچ ہو رہا تھا تو پہاڑ اپنی چوٹیاں جھکائے ان کی طرف سرک رہے تھے اور بادلوں کی بھیڑ کی بھیڑ ان کے سروں پر آکھڑی ہوئی تھی اور ہریالی چاروں اور سے کھنچ کر ان کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی تھی اور ان پر آنکھیں گاڑے اور گہری ہونے لگی تھی اور۔۔۔ اور ان کے قریب ہی وہ بوڑھا بندر آپ ہی مرد اور آپ ہی عورت بنے انہی کی مانند رقصاں تھا اور کٹھ پتلی والے کے بیٹے کو لگ رہا تھا کہ وہی وہاں وہ بندر بن کے ناچ رہا ہے اور وہ بندر یہاں اس جگہ پتلیاں نچا رہا ہے۔

بات تو سنو!...... نہیں!...... اب تو ہمارا بیاہ بھی ہو چکا ہے۔ نہیں پھر بھی۔ مگر دلہنیا خوف کے باوجود یہ نہ چاہتی تھی کہ دولہا اس کی بات مان لے۔ ہاں اور نہ، کے اس رقص میں آخر اس نے اس کے منہ میں منہ ڈال دیا۔ نہیں!...... جسم سے جسم جوڑ لیا...... نہیں!...... اور دونوں جانیں ایک ہی قالب میں ناچ ناچ کر بے سدھ ہونے لگیں اور...... اور بادلوں کی ساری بھیڑ نشاط و کیف سے موسلادھار برس پڑیں۔

کٹھ پتلی والے کا بیٹا ٹھٹھرنے لگا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی قدرت جب خوش ہوتی ہے تو آسمان پھاڑ کر دیتی ہے۔ یہ تو لینے والے کا کام ہے کہ اپنے چھوٹے وسوسوں سے کام لے کے لے، تاکہ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ وہ پہاڑ کی اوٹ میں تو ہو گیا تھا مگر پانی کے چھینٹے یہاں بھی بڑے جوش و تپاک سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے رہے اور آخر جب تھمنے میں آئے تو وہ خوب بھیگ کر سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کو اتار کر نچوڑا، انہی سے بدن پونچھا، پھر نچوڑا اور پھر انہیں سکھانے کے لئے اپنے بدن پر پھیلا کر لٹکا

لیااور پہلے کی مانند وادی کی طرف تیز گام ہولیا۔

داد‌ااس سے کہا کرتا تھا کہ ہاں اور نہ کا یہ کھیل ہمارے سب کھیلوں کا راجہ ہے اور جو بھی اس کھیل کو اپنی انگلیوں پر باندھ لے وہ بھی راجہ سے کم نہیں۔۔ دادااسے شروع کرنے سے پہلے منہ میں تھوڑی سی افیون رکھ لیا کرتا تھا۔ وہ افیون تو نہیں کھاتا تھالیکن یہ کھیل کھیلتے ہوئے اسے بھی یہی لگتا تھا کہ دادا کے مانند منہ میں افیون رکھے ہوئے ہے۔ دراصل اسی لئے وہ اس کھیل سے بچ کر رہتا تھا۔ کوئی سچ مچ کا راجہ جھومتے ہوئے ہوش کھو بیٹھے تو اس کے بیسیوں نوکر چاکر ہاتھ باندھ کر اپنا ہوش پیش کر دیتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے راجہ کو ہوش کھو کر اگلے جہان کے راستے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

تھوڑی ہی دور آکر اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کوئی بھی تو نہ تھا۔ وہ ہنسنے لگا۔ پہاڑوں میں گھری ہوئی اکیلی راہوں پر ہمارے وچاروں کے سوا کون ہمارا پیچھا کرے گا؟...... سردی؟...... ہاں، سردی تو بن بلائے چلی آتی ہے۔ داد‌ااسے سمجھایا کرتا تھا، ہر ایک کی خوب آؤ بھگت کرو بیٹا، مگر سردی کو پاس نہ پھٹکنے دو۔ اسے خوش رکھنے کے لئے ہمارے پاس اتنے کمبل کہاں ہیں؟...... ہاں اس وقت ایک موٹا سا کمبل ہوتا تو چین آجاتا۔ کسے؟ سردی کو یا مجھے؟ سردی کو ہی۔ وہ نہ ہو تو کمبل لے کے مجھے کیا کرنا ہے؟ سردی سے بچنے کے لئے کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے دوڑنا شروع کر دیا اور دوڑنے سے اس کے تھیلے میں پتلیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجنے لگیں۔

"ہماری جان ہی لینا ہے تو اس طرح کیوں لیتے ہو؟ سیدھے کسی پتھر پر مار کر پھوڑ دو۔"

"تمہیں سردی لگے تو جانوں۔ کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے اپنے کپڑوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھا جو ابھی سوکھے نہ تھے۔ "لاؤ اپنی چھال مجھے دے دو اور میری کھال لے لو۔"

پتلیاں اچھل کر تھیلے کے منہ پر آگئیں۔ "ایک چھال ہی کیا، چاہو تو جان بھی لے لو۔" اس نے دوڑنے سے اپنے آپ کو روک لیا اور چلنے لگا اور چلتے ہوئے بڑے پیار سے پتلیوں کے ننگے جسموں پر ہاتھ پھیر پھیر کر انہیں تھیلے میں ٹکانے لگا۔

یہ دونوں کٹھ پتلیاں کٹھ پتلی والے کے بیٹے کے باپ کی بنائی ہوئی تھیں۔ دادا نے اپنے بیٹے سے کہا تھا یہ پتلیاں صرف میری سمجھ بوجھ سے کام کرتی ہیں مگر فکر مت کرو۔ اگر تم

واقعی میرے بیٹے ہو تو تمہاری سمجھ میں میری ہی سمجھ کام کرے گی...... کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے واقعی ثابت کر دکھایا کہ وہ اپنے ہی باپ کا بیٹا ہے۔ مگر کیا وہ یہی ثابت کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا؟...... یا یہ، کہ کٹھ پتلی والے کے بیٹوں کے سب سے پہلے باپ کی بیوی نے نہیں، نہیں کہتے ہوئے دراصل ہاں ہاں، کہا تھا؟ میری کالی نے تو پہلی بار ہی آخری نہیں کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

شروع میں جب وہ ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو اسے شرم محسوس ہوتی تھی کہ وہ لوگ کٹھ پتلیوں کا تماشہ دکھا کر پیٹ پالتے ہیں۔ جیسے چاہا کٹھ پتلیوں کو نچالیا۔ ان کے نام پر اپنی گپیں ہانک کر لوگوں کو خوش کیا اور ان سے جو ملا لے آئے۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ اس دھندے میں پڑے گا ہی نہیں مگر دادا کو اس کے ارادوں کی بھنک پڑی تو اس نے اسے اسکول بھیجنا بند کر دیا۔ انہی دنوں وہ گھر سے بھاگ کر دو دن پہاڑوں میں بھٹکتا رہا اور دل ہی دل میں کئی بار دادا دادی کا کھیل کھیل کر گھر لوٹ آیا۔ دادا دادی کا کھیل بھی آس پاس کی بستیوں میں بہت مشہور تھا۔ کٹھ پتلی والے کا بیٹا جی ہی جی میں دیکھ رہا تھا کہ وہ وادی میں پہنچ گیا ہے اور اپنا تماشہ شروع کرنے والا ہے اور چاروں طرف سے لوگوں کی آوازیں آرہی ہیں...... دادا دادی!...... دادا دادی!...... اور وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہا ہے، ہاں، ہاں، صبر کرو، ابھی دکھاتا ہوں۔ کھیل شروع ہوتا ہے: دادا دادی کا بیٹا کٹھ پتلی والے کے بیٹے کی انگلیوں پر ناچتے ہوئے سب سے بڑے پہاڑ کی چوٹی کے سامنے آجاتا ہے اچھل اچھل کر اسے بہ آواز بلند مخاطب کر کر کے کہتا ہے، تم مجھے جانتی ہو، نہ میں تمہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ دوسرے ہاتھ کی کٹھ پتلی پہاڑ کی چوٹی بنی ہوئی ہے اور دادا دادی کے بیٹے کو سن کر اس کی طرف جھکتی آرہی ہے اور ممتا سے کانپتے ہوئے کہہ رہی ہے، نہیں، ایسے تو نہیں ہے۔۔ نہیں، میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ چوٹی رک کر رہ گئی ہے اور اپنی ممتا کی بے آبروئی پر پگھلنے لگی ہے اور پانی اس کے نشیب کے کئی اطراف بہہ نکلا ہے مگر دادا دادی کا بیٹا اسے چھوڑ کر ہنستے ناچتے کسی میدانی شہر کے راستے پر مڑ جاتا ہے۔ طغیانی میں آئی ہوئی یہ ندی اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے اپنے کناروں سے باہر آجاتی ہے۔ نہ جاؤ، سوچو، تمہارے دادا دادی پر کیا بیتے گی...... ہم سب پر کیا بیتے گی...... نہ جاؤ...... مگر دادا دادی کا بیٹا چلا جاتا ہے اور دادا دادی کو اس کے جانے کی خبر ہوتی ہے تو پہلے تو دونوں اس کی انگلیوں پر

اس طرح ناچتے ہیں جیسے ان کا دم پھڑ پھڑا رہا ہو، پھر وہ تھمنے لگتے ہیں اور دادی دادا کی طرف دیکھ کر کہتی ہے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سن کر دادا کا دم پلٹنے لگتا ہے اور وہ بھی کہتا ہے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر دونوں گہری سنجیدگی سے سر جھکا لیتے ہیں، پھر دادی اپنے سر کو ڈھیلے سے اٹھا کر گویا ہوتی ہے، نہیں، وہ اب کبھی نہیں لوٹے گا۔۔ اور دادا بھی اپنا جھکا ہوا سر اس طرح اٹھاتا ہے جیسے سر کی جگہ پورا پہاڑ اٹھا رہا ہو۔ اور دھیرے سے کہتا ہے، ہاں اب وہ کیوں لوٹے گا؟ پھر ایک کٹھ پتلی بج کر بول اٹھتی ہے۔ نہیں، لوٹ آئے گا۔ ٹھن۔۔ ٹھن۔۔ ٹھنن۔۔ ہاں ضرور لوٹ آئے گا!...... ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڈھا بڈھی ناچنے لگتے ہیں۔ ٹھن۔ ن۔ ن۔ ن۔۔ لوٹ آئے گا۔۔ ٹھن...... ن...... ناچتے ناچتے دونوں نڈھال ہو کر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

"کٹھ پتلی والے کے جو بیٹے اپنے بیٹوں کو اس کھیل پر حاوی کر دیتے ہیں وہ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں" دادا اسے بتایا کرتا تھا "یہ کھیل مجھے میرے باپ نے بڑی محنت سے سکھایا تھا۔" بیٹا!...... وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔۔ مجھے مرنے سے اس لئے خوف نہیں کہ میں نے اپنا بیج اور ہنر دونوں تمہیں سونپ دیئے ہیں۔ مر بھی جاؤں گا تو موت میرا کیا بگاڑے گی؟ تم بس اتنا کرو کہ تمہارے جب بیٹا ہو تو اس سے باپ کی بجائے دادا کہلواؤ......" اسی لئے وہ اپنے آپ کو دادا بنائے ہوئے تھا۔

کٹھ پتلی والے کے بیٹے کو پھر لگا کہ اس کے پیچھے کوئی چلا آرہا ہے۔ لیکن اس بار اس نے سر موڑ کر تسلی کرنے کی بجائے اپنے آپ کو یوں ہی سمجھا دیا، بتا چکا ہوں، اتنے بڑے پہاڑوں میں گھری ہوئی اکیلی راہیں ہیں۔ یہاں کون کس کے پیچھے آتا ہے؟۔۔ جب اس نے پہلے پہل کٹھ پتلیوں کا تماشہ دکھانے کے لئے گھر سے نکلنا شروع کیا تو وہ ابھی چھوٹا ہی تھا اور اسے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ دادا کہیں چھپ کر اس کے پیچھے ہی چلا آرہا ہے۔ ایک بار تو جب وہ نصف راستے تک چلا آیا تو دادا اسے اچانک ایک الگ راستے سے نظر آگیا۔ اسے بہت غصہ آیا۔

"کل سے میں نہیں جاؤں گا دادا۔ تم ہی اپنی کھیل دکھانے چلے جایا کرو۔"

"نہیں، بیٹا۔ میرا اپنا کھیل اب دو چار دن میں ختم ہونے والا ہے۔ اس عمر میں میں کیا کھیل دکھاؤں گا؟"

"تو پھر آج پھر میرے پیچھے کیوں آ گئے؟"

"بس اس لئے نکل پڑا کہ تمہیں کھیل دکھاتے دیکھ کر اپنے وہ دن پھر سے جینے لگوں گا۔"

کٹھ پتلی والے کے دادا کو مرے کئی برس ہو لئے تھے مگر اسے لگتا تھا کہ دادا ابھی تک جیے جارہا ہے اور وہ خود آپ نہ جانے کہاں ہے۔ اسے پھر معلوم ہوا کہ پیچھے کوئی آرہا ہے اور اس نے پھر اپنے آپ کو سمجھایا، اور کون ہوگا؟ اپنے آپ میں آپ تو تم ہو نہیں، سو جہاں جاتے ہو اپنے پیچھے آرہے ہوتے ہو۔

پتلی والے کا بیٹا ٹھنڈا آدمی تھا مگر گرم ہونے لگا اور گرم ہو کر اسے خیال آیا کہ ساری سردی تو میں برداشت کرتا ہوں مگر میری کایا پر دادا نے قبضہ کر رکھا ہے۔ میری زندگی بھی دادا کو ہی جئے جانا ہے تو وہی جیے چلا جاتا مجھے بیچ میں کیوں لایا؟...... اس نے اپنا سر عقب میں موڑا کہ ایک نظر اپنے آپ کو دیکھ لے مگر وہاں کوئی نہ تھا...... وہ...... وہاں چند جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔۔ انہیں کوئی ہلا نہ رہا تھا۔۔ وہ اتنی خوش اور آزاد نظر آتی تھیں کہ یقیناً اپنی ہی جڑوں سے لہرا رہی تھیں۔

کٹھ پتلی والے کے بیٹے کے بدن پر لٹکے ہوئے کپڑے ابھی گیلے ہی تھے۔ تاہم سردی کی تاب نہ لا کر اس نے انہیں ویسے ہی پہن لیا۔ آخر کپڑے ہیں ذرا گیلے بھی رہ گئے تو کیا؟ گرمی تو پہنچائیں گے ہی۔ وہ پھر دوڑنے لگا مگر تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس کی سانس پھولنے لگی اور وہ پیروں کو گھسیٹتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

"تیز چلو، دادا، اس طرح چل کر کب پہنچو گے؟"

کئی بار ایسا ہوا۔ وہ اپنے آپ کو اپنا باپ سمجھ کر ہی پکار لیتا اور یوں اپنی کم مائیگی کی ذمہ داری اس کے سر تھوپ کر اس کو تسلی ہو جاتی۔ اور کیا؟...... کوئی بھوت کی طرح سر پر سوار ہو تو میری سمجھ کیسے کام کرے؟ کٹھ پتلی والے کے بیٹے کا ایک بھوت کا کھیل بھی بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ایک بھوت کسی نئی بیاہتا پر عاشق ہو کر اس کے سر میں سما گیا۔ اس کا شوہر اسے بہت چاہتا تھا مگر بے چارے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ بھوت نے دلہن کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ اس کا شوہر ہے اور اس کا شوہر ان دونوں کا غلام۔ سو وہ اپنے میاں کو ہر دم گالیاں بکتی رہتی اور اپنے سر میں گھسے ہوئے بھوت کے گلے میں باہیں ڈال کر ہوا میں اڑنے لگتی اور

اڑتے ہوئے پاگلوں کی مانند زور سے ہنس ہنس کر چلانے لگتی۔ آخر ساری بات دولہے کی سمجھ میں آگئی اور اس نے اپنی دلہن کو باندھ کر اتنا پیٹا کہ بھوت کا بھر کس نکل گیا اور وہ اس کا سر خالی کر کے ننگے پاؤں بھاگ نکلا...... یہاں کٹھ پتلی والے کا بیٹا اپنے دادا کی مانند یہ کہنا نہ بھولتا تھا کہ بھوت یوں بھی جوتے تھوڑا ہی پہنتے ہیں...... بھوت نے دلہن کا سر خالی کر دیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ اپنے میاں کی طرف فخر مندی سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی، اتنی مار پٹائی کر کے آپ کے بازو دکھ گئے ہوں گے، لایئے میں دبائے دیتی ہوں۔

کٹھ پتلی والے کے بیٹے کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی دلدار اسے بھی پیٹ کر دادا کا بھوت اس کے سر سے نکال دے۔ یہ نہیں کہ دادا سے اُسے پیار نہ تھا۔ اس کی موت پر وہ زار و قطار رویا تھا۔ پر ایک بار یا دس بار جی بھر کے رولیا نا، اور جسے رولیا جائے اس کا بھوت ہر دم سر میں کیوں سمایا رہے۔ اپنی سانس تو وہ آپ ہی لیتا ہے، پھر اس کا جینا بھی اسی کی سمجھ بوجھ سے کیوں نہ ہو؟

کٹھ پتلی والے کے بیٹے کے گیلے کپڑوں کی سردی اس کے بدن میں سرایت ہو چکی تھی اور اس کے بدن سے نکلتی ہوئی بخار کی تپش سے اس کے کپڑے بالکل خشک ہو چکے تھے اور اسے اپنے بھاری سر میں اتار چڑھاؤ میں سے ہوتا ہوا ایک من مانا کھلا راستہ دکھائی دے رہا تھا جو ساری کائنات میں جہاں چاہو، وہیں لے جائے۔

کٹھ پتلی والے کے بیٹے نے من ہی من میں اپنی دونوں پتلیاں تھیلے سے نکال لیں اور انہیں کسی رنگ روپ میں سجائے بغیر ویسے ہی بے لباس اور بے جنس اپنی انگلیوں پر جمالیا اور جیسے بھی وہ سوچ رہا تھا، پتلیاں دیکھتے ہی دیکھتے ویسے ہی بن گئیں۔ ایک کالی جو بے حد گوری تھی اور جس سے اس کی شادی ہو جاتی تو وہ خوشی سے پاگل ہو کر اپنے آپ کو ہی انگلیوں پر نچاتا پھرتا اور ایک کالی کا شوہر کوا، جس کی چمکتی ہوئی سیاسی اور کھلنڈری کائیں کائیں پر کالی دل و جان سے فدا تھی اور ...... ایک وہ آپ، جو اپنے دادا کی صناع انگلیوں پر ناچتے ہوئے وہاں سے ایک دم اکھڑ کر زمین پر آگرا اور ابھی اس کے دادا کی انگلیاں خالی خولی ہل رہی تھیں کہ وہ اپنی یہ دونوں پتلیاں نچاتے ہوئے سر ہی سر میں اس کائناتی راستے پر بے اختیار اتر گیا۔

کوا خوشی سے پھر پھڑاتے ہوئے کائیں کائیں کیے جا رہا تھا۔ ادھر دیکھو کالی۔ یہ ساری زمین میری ہے۔ یہاں سے اس پہاڑ تک اور اس سے بھی آگے۔ وہاں۔ ان درختوں کی اوٹ

میں ایک چشمہ ہے۔ تم اور میں اکٹھے وہاں نہایا کریں گے اور ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا، صرف تم اور میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ تِلی والے کا بیٹا ناچتے ناچتے ان کے اوپر چڑھ آیا۔ کہاں؟ مجھے بھی دکھاؤ۔ ارے چل ہٹ!...... آؤ کالی وہ دیکھو، وہ ہماری گائے ہے۔ بڑا میٹھا دودھ دیتی ہے۔ اسے پی کر تم اس کے دودھ سے بھی سفید نکل آؤ گی۔ وہ پھر کوے کی پھڑ پھڑاہٹ کے قریب آ کر ناچنے لگا...... مگر کالی تو پہلے ہی تمہاری گائے کے دودھ سے سفید ہے۔۔۔ چل ہٹ!...... کالی، میری ماں نے تمہارے لئے اپنے سونے کے گہنے نکال کر رکھے ہوئے ہیں۔ آؤ تمہیں ماں کے پاس لے چلوں۔۔۔ کٹھ تِلی والے کا بیٹا پھر ناچ کر آگے آ گیا۔ میں بھی آؤں؟...... ہٹ! ہٹ!...... دونوں پتلیاں خوشی سے ہانپ رہی تھیں...... ہاں؟...... نہیں، ابھی نہیں؟...... کیا تم نے مجھے بلایا ہے کالی؟...... ارے ہٹ! ہٹ......! کٹھ تِلی والے کا بیٹا دیکھتا رہ گیا اور کالی اور کوے کی پتلیاں درختوں کی اوٹ میں چشمے میں نہانے کے لئے فرار ہو گئیں اور وہ اپنے ذہن میں چڑھاؤ کے اس راستے پر خالی انگلیاں ہلاتے ہوئے اپنے جسم کو گھسیٹتا رہا۔

اس کا بدن بخار میں جھلس رہا تھا اور پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں سے بہ مشکل دو چار قدم آگے کا راستہ دکھائی دے رہا تھا اور اسے بدستور محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے مگر وہ اسے نظر انداز کر کے اپنی انگلیاں ہلائے جا رہا تھا...... یہ تِلی دادا کی ہے جس کا بھوت اس کے سر میں گرمی کی شدت کی تاب نہ لا کر اس کی انگلیوں پر آ گیا ہے اور یہ اس کے دادا کے باپ کی...... اور یہ وہ خود آپ ہے اور وہ بے سدھ ہو کر انہیں نچانے لگا ہے...... اور کٹھ تِلی والے کے بیٹوں کی یہ تینوں نسلیں نہ جانے کدھر کا رخ کیے ہوئے ہیں...... گھر کا؟...... کہاں ہے گھر؟...... دیکھو کتنے میٹھے میوے لٹک رہے ہیں؟...... تمہیں کیا؟...... یہ دھرتی؟...... تمہیں کیا؟ دھرتی ان کی ہے جو اس کے مالک ہیں۔۔۔ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہو؟...... جا رہے ہیں تو کہیں تو جائیں گے...... ان درختوں میں سے کیوں جھانک رہے ہو؟ کوا اور کالی ننگے نہا رہے ہیں؟...... سردی لگ رہی ہے؟...... خیالوں کے کمبل اوڑھ لو...... کیا فائدہ خیالوں کے کمبلوں کے اون ہوتی ہے نہ سوت...... تو ہم کیا کریں؟...... گرم گرم دودھ؟...... کہاں سے لائیں؟...... سردی؟...... ہم کیا کریں؟...... چلا نہیں جاتا؟...... تو مت چلو بابا...... نہیں، لوٹ آئے گا...... نہیں، کبھی نہیں لوٹے گا......

پتلی والے کے بیٹے کی آنکھوں میں اندھیرا گھور ہونے لگا۔ شاید وہ وادی کے منہ پر آپہنچا تھا۔ اپنے گرتے ہوئے حواس کے بوجھ تلے آپ بھی گرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لینے سے پہلے دیکھا کہ پیچھے سے وہی بوڑھا بندر اس کے تھیلے پر جھپٹ رہا ہے...... اور بے ہوشی کے عالم میں اس کی آنکھوں میں پتلیوں کا ناچ ہو رہا ہے...... ہاں...... نہیں...... سنو تو...... نہیں!......

اور نامعلوم کب اس نے ذرا سی آنکھ کھولی اور سایوں میں دیکھا کہ وادی کے لوگ خوشی سے تالیاں بجا بجا کر اس بوڑھے بندر کو گھیرے ہوئے ہیں اور بندر انہیں اتنی کارگری سے دادا دادی کا کھیل دکھائے جا رہا ہے کہ وہ بے ہوشی میں بھی اسے گھور گھور کر دیکھنے لگا ہے...... نہ! نہ جاؤ...... رک جاؤ!...... اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔ نہیں، یہ تو میں ہی ہوں...... پتہ نہیں، اس نے بندر کو دیکھ کر اپنے آپ کو بتایا، یا پتلی کو...... رک جاؤ!...... ہاں، میں ہی ہوں...... نہیں، میں کون؟ یہ تو دادا ہے...... نیم بے ہوشی میں وہ گویا جی ہی جی میں دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ نہیں، دادا بھی کہاں؟ دادا کا بھوت ہے جو میرے سر سے نکل گیا ہے...... اور وہاں...... وہ بے لباس...... بے جسم پتلی...... وہ دیکھو...... وہ افتاں و خیزاں سایہ آپ ہی آپ ناچتے ہوئے نہ جانے کدھر کا رخ کیے ہوئے ہے...... ہاں، آپ ہی آپ کیسے؟ وہ بندر ہی تو اُسے نچا رہا ہے...... نہ جاؤ!...... خدا کے لئے رک جاؤ!......

ہیر رانجھا

"ہائے۔ ئے!"

"کیوں، کیا ہوا؟" بوڑھے رانجھے نے کھانس کھانس کر گلے سے بلغم نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا اور ہیر کے جواب کا انتظار کیے بغیر اضافہ کیا 'کھ کھا۔ کھ۔ ہم نے اپنی ساری زندگی اُوٹ پٹانگ میں ہی نکال دی ہیرے۔ کھ۔"

"ہاں، مگر ابھی نکلی کدھر ہے۔" ہیر کی آواز اس کے جھریائے منہ سے پھڑ پھڑا کر برآمد ہوئی۔

"پر ہیرے، اب نکل ہی جائے تو ٹھیک ہے۔ کھا کھا۔ کھاؤں!...... اُخ تھو!" رانجھا گلے میں پھنسا ہوا بلغم نکل جانے پر خوش نظر آنے لگا۔ "لوگوں نے ہمیں چنگی بھلی موت کے بعد بھی مرنے نہ دیا۔"

"ہاں، رانجھے، لوگ تو لوگ ہی ہوتے ہیں، جینے دیتے ہیں، نہ مرنے۔ ہائے۔ ئے!"

"کیوں، کیا ہوا؟"

"اور کیا؟ وہی جوڑوں کی پرانی پیڑ۔"

"تو پھر روتی کیوں ہو؟ جوڑوں کی پیڑ ہی تو ہے۔ اس کے گلے میں بلغم کا ایک اور گچھا کھسک آیا تھا۔ "کھ کھا۔ کھاؤں...... دوسرے سبھی لوگ تو ستر اسی سال بھوگ کر مزے سے پار جا لگتے ہیں۔ کھ!۔ ایک ہم ہیں۔ کھاؤں! کہ ٹھکانے لگنے میں ہی نہیں آ رہے۔"

"سچی ابھی تک ہم زندہ ہیں رانجھے؟"

عجیب عورت ہو۔ زندہ ہیں مورکھے تو زندہ ہی تو ہیں۔

"ہائے۔ ئے۔"

"تمہاری ہر دخت کی ہائے ہو سے میں تنگ آ گیا ہوں۔"

"تنگ آ گئے ہو تو میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے۔؟"

"ارے بھئی، تمہیں جوڑوں کی پیڑ ہے اور مجھے پسلیوں کی۔ تمہاری طرح میں کوئی آسمان تو سر پر نہیں اٹھائے رکھتا۔"

"تمہیں کیا پتہ، جوڑوں کی پیڑ کتنی جان لیوا ہوتی ہے؟"

"پسلیوں کی پیڑ بھی جان لیوا ہوتی ہے، پر لابھ کیا؟ جانیں ہماری تو ویسی کی ویسی اٹکی ہوئی ہیں۔"

"ہاں، جان نکل جائے تو چین نہ آجائے؟ لوگ ہمیں اب اپنی کتھا کہانیوں سے باہر کیوں نہیں دھکیل دیتے؟"

رانجھا اچانک بے اختیار ہنسنے لگا۔

"روتے روتے ایک دم ہنسنے لگتے ہو تو معلوم ہوتا ہے، تمہاری پسلیوں کی پیڑ بڑھ گئی ہے۔"

"ہہ ہہ ہا۔ ہہ!۔"

"دھیرے ہنسو، نہیں تو کوئی پسلی ٹوٹ جائے گی۔"

"ایک بات پوچھوں، ہیرے؟"

"دس پوچھو، پر ہنس ہنس کر مجھے ڈراؤ مت۔"

"ذرا سوچو، جوانی میں ہم کتنا جھوٹ بولا کرتے تھے۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"جھوٹ کیسا ہوتا ہے؟۔ بس جھوٹ۔ بڑا میٹھا، پر جھوٹ ہی جھوٹ!"

"تو کیا ہوا؟ میٹھا تو تھا۔"

"جھوٹ بولنے کی مکھنی خواہش سے میرا منہ بھر جاتا تھا اور پھر تمہارا ہاتھ پکڑ کر، لہجے میں ٹھیس پیدا کر کے......"

"جوانی میں پتہ ہی نہیں چلتا، رانجھے، کہ ہم خوش ہیں یا ناخوش۔"

"ٹوکتی کیوں ہو؟۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر میں بول اٹھتا تھا، میں ہی تمہاری ہیر ہوں، ہیرے۔ ہہ ہہ ہاہہ!۔ اور تم مجھے اسی بھرے بھرے لہجے میں جواب دیتی تھیں، اور میں تمہارا رانجھا، رانجھے۔ سر نہ پیر۔ آپ ہی ہیر اور آپ ہی رانجھا۔ ہہ ہاہہ۔ ہہ!۔ نری پری بکواس!۔"

"ہڑیا، بکواس کیوں کہتے ہو؟ روح کی دُکھن میں ہر کوئی اپنا آپ ہی لگتا ہے۔"

"ہہ ہہ ہا۔ کھ کھاؤں کھاؤں۔ کھ!۔"

"میں نہ کہتی تھی اتنا مت ہنسو؟"

"اخ تھو!۔" بلغم تھوک کر رانجھے کو پھر قرار آ گیا۔

"ہائے۔ہائے!"

"اب کیا ہوا؟"

"تمہیں کیا؟ کبھی اپنی پسلیوں کو بھولو تو میرے جوڑوں کی بھی سوچو۔"

"لڑتی کیوں ہو؟ صبر سے کام لو۔"

"صبر سے کیسے کام لوں؟۔"

"یہی تو تمہیں بتانے جا رہا تھا کہ ......"

"میں سب جانتی ہوں تم کیا بتانے جا رہے تھے۔"

"کھ کھ۔ کھاؤ!۔" رانجھے کے گلے میں بلغم کا ایک اور گچھا آن پھنسا تھا۔ "درد تو تبھی جان پڑتا ہے جب اپنے ہی بدن میں دُکھن ہو۔"

"اتنے سیانے بنے پھرتے ہو رانجھے، کوئی اپائے کیوں نہیں نکالتے، جس سے اب ہماری چھٹی ہو جائے۔"

"اس کا تو صرف ایک ہی اپائے ہے۔"

"جلدی بتاؤ، کیا؟ جیسے بھی ہو اب اس مر مر کے جینے سے چھٹکارہ ہو۔ہائے۔ ئے!"

"خدا کے لئے پہلے اپنی یہ ہائے ہائے بند کرو۔"

غصے میں رانجھے کو پھر کھانسی چھڑ گئی۔

"تم بھی خدا کے لئے پھر سے ہنسنا شروع نہ کر دینا، نئیں تو کھانسی تھمنے میں ناں آئے گی۔"

"کھ۔ کھاؤں۔ کھ!۔" رانجھے کے گلے میں پھنسا ہوا بلغم کا گچھا یکبارگی اس کے منہ کے سامنے آ گرا، اور وہ چین سے مسکرانے لگا۔ "ہاں، میں کیا کہنا چاہ رہا تھا۔"

"میں کیا جانوں؟"

"ہاں، یہ، کہ جینے سے چھٹکارہ پانے کا ایک ہی طریقہ ہے"

ہیر خوشی سے اپنے جوڑوں کا درد بھی بھول گئی۔ "بات کو ہمیشہ بے وجہ لمبا کئے جاتے ہو۔ جھٹ سے بتاؤ، کیا؟"

"یہ، کہ کسی طرح اپنی کتھا سے باہر آ بسو، پھر دیکھو کیسے چٹکیوں میں جان نکلتی ہے۔"

"تو پھر آؤ، اپنی کتھا سے باہر نکل آتے ہیں۔ انتظار کا ہے کا؟۔ آؤ!۔"

"مورکھ کی مورکھ ہو۔" رانجھا اپنی بوڑھیا کو جی بھر کے دیکھنے کے لئے ذرا رک گیا۔ "امر کہانیوں کے جادوئی تانے بانے سے نکلنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔"

محشر

کیا؟...... میری کہانیاں پڑھ کے تمہاری سمجھ میں نہیں آتا، کون اچھا ہے، کون برا؟......اور کس سے محبت کی جائے، کس سے نفرت؟......ارے بھائی، تمہارا مسئلہ تو کہیں تفصیلات میں جا کے شروع ہوتا ہے، میری سمجھ میں موٹا سایہ بھی نہیں آتا، کون کیا ہے؟...... یہ خوب رہی۔ بات ہماری کہانی کی کر رہے ہو اور قصہ رامائن کا لے بیٹھے ہو۔ رامائن کے یگ میں رام پورا رام تھا اور راون، پورا راون...... ہاں، اسی لیے ایک فیصلہ کن جنگ کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ رہا...... مگر نہیں، فیصلہ تو پہلے سے ہی طے تھا......اور کیا، یہی، نیکی کی فتح...... ٹھیک ہے بھائی، بد بہت بلوان ہوتا ہے، پر سبھی جانتے تھے جیتیں گے راجہ رام ہی۔ کوئی کتنا بھی بلوان ہو، بھگوان کو وہ کیسے جیت سکتا ہے؟...... نہیں رامائن کے یگ میں بھگوان بند آنکھوں سے بھی ہو بہو نظر آجاتا تھا...... ہاں، بلکہ بند آنکھوں سے ہی نظر آتا تھا...... آج، آج کیسے نظر آئے؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے بھگوان تھوڑا ہی دِکھ جاتا ہے......، ہاں بھائی دکھ جائے تو آدمی اسے چڑیا گھر میں لا کھڑا کرے؟...... تب کی چھوڑو، میں اب کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں تو آدمی اتنا سرل تھا کہ بھگتی اور شردھا سے اس کی دم اور بھی باہر نکل آتی تھی، جسے وہ بڑے فخر سے وجود پر لٹکائے پھرتا تھا۔ ایسا آدمی تو سامنے نہ بھی موجود ہو تو صاف نظر آتا رہتا ہے۔ اس کال کی اور کیا بتاؤں؟ اچھا اس قدر اچھا تھا کہ بھگوان کا اوتار معلوم ہوتا تھا اور برا اس قدر برا کہ ایک ہی گردن پر دس سر اٹھائے گھوما پھرتا تھا کہ ٹکراؤ ہو تو صرف بھگوان سے، کیڑے مکوڑوں اور آدمیوں سے کیا لڑنا؟ سو آدمی بہر حال محفوظ تھا۔

کیا؟...... نہیں، پہلے ذرا سوچ کر بتاؤ، ہمارے زمانے میں تمہیں کوئی منہ ماتھے میں نظر آتا ہے؟ کسی کی تصویر بنتی ہے؟...... ٹھیک کہتے ہو تصویروں کی پہچان ایک دم طے ہو جاتی

ہے مگر کسی کی کوئی تصویر بنے تب نا!...... نیتاؤں کی کیا؟ وہ تو گورو لوگ ہیں، پبلک کو درشن دیتے ہوئے ایسا پوز بنا لیتے ہیں گویا اپنی بجائے اپنی تصویر ہوں۔ انہیں معلوم ہے کہ جیتے جاگتوں کو جتنا بھی دھیان سے دیکھیں وہ اتنا ہی او جھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بے چارے کوئی ہوں تو محسوس بھی ہوں۔ نہیں؟...... نہیں کیوں؟...... ادھر آؤ اور کھڑکی کے باہر میری انگلی کی سیدھ میں دیکھو...... ہاں، وہ سفید سوٹ والا لمبا شخص جو پارک میں اپنی گاڑی سے نکل رہا ہے۔ غور سے دیکھو اور بتاؤ، کیا تم اسے جانتے ہو؟...... نہیں!...... میں بھی اسے نہیں جانتا۔ منہ ماتھے میں کہیں موجود ہو تو جانوں۔ ہماری بلڈنگ کے اسی فلور پر رہتا ہے۔ اپنے آفس سے لوٹ رہا ہے۔ کیا تمہیں بھی نہیں لگتا کہ بدستور وہیں بیٹھا ہے اور اپنے کسی نئے بزنس پراجیکٹ کے کاغذات فائل میں جما رہا ہے...... کیا؟...... کیوں نہیں، بھائی؟ جہاں دھیان، وہیں آدمی...... میرا ایک امریکی دوست ہوا کرتا تھا۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر دراز ہوتا تو اس کی بیوی اچانک جھلا کر بستر کے باہر اچھل آتی۔

"کیوں؟"

"کیوں کیا؟" اس کی بیوی اسے جواب دیتی۔ "تمہیں گھر لانے، میں تمہارے دفتر جا رہی ہوں۔"

"اور اگر میں وہاں نہ ہوا تو؟"

"تو کیا؟ تمہارا بزنس پارٹنر تو ہوگا۔"

نہیں، بھائی، ہنسنے کی بات نہیں۔ ہم جب جو بھی کرتے ہیں، بزنس ہی کر رہے ہوتے ہیں اور بزنس میں تو جس سے زیادہ نفع ہو، وہی اپنا...... ہاں، میں اسی سفید سوٹ والے کی بات کر رہا ہوں۔ آتے جاتے ہماری کبھی مڈ بھیڑ ہو جائے تو ہم بڑے بے محبت تپاک سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں...... نہیں، ہم ایک دوسرے سے نفرت بھی کیوں کریں؟ ہم محبت کرتے ہیں، نہ نفرت، بس جو بھی کرتے ہیں، صرف کرتے ہیں...... ہاں، ذرا سی اونچائی سے بھی وہ کتنا چھوٹا نظر آرہا ہے، پر بھائی، ہم وہاں نیچے ہوں اور وہ یہاں اوپر تو ہم بھی اُسے ویسے ہی چھوٹے سے نظر آئیں...... کیا؟...... آمنے سامنے ہو کر دیکھیں؟ آمنے سامنے ہوں گے تو ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا پڑ جائے گا اور یہی کھٹکا لگا رہے گا کہ کہیں پکڑے نہ جائیں۔ کس بات پر؟ سو باتیں ہوتی ہیں جن کی ہم خود اپنے آپ

کو بھی بھنک نہیں پڑنے دیتے...... ہاں، وہ تو شکر ہے کہ ٹیلیفون ایجاد ہو گیا، وگرنہ ہمارے مجلسی آداب کا تقاضہ ہوتا کہ ہمیشہ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے بات چیت کرو۔

نہیں، بھائی میں کوئی کہانی نہیں گھڑ رہا ہوں کہ خود کو ایک اسی شخص کے آگے پیچھے گھومتے چلے جانے کا پابند بنائے رکھوں۔ بیان میں سچائی ہو تو بات سے بات نکلتی رہتی ہے...... لو، پہلے اسی سفید سوٹ والے کا ہی قصہ بیان کیے دیتا ہوں۔ اس کا نام ہنس راج ہے...... کیا؟...... نہیں، صرف نام جان لینے سے ہم اسے کیونکر جاننے لگیں گے، کوئی اپنا نام ہوتا ہے یا خود آپ؟...... خیر، جیسے بھی ہے۔ کیا ہوا کہ پچھلے سال ہنس راج کا بزنس پارٹنر اس کی بیوی اغوا کر لے گیا...... ٹھہرو، دراصل ہوا یہ کہ سیتا ہی راون بھگا لے گئی...... کمال کرتے ہو؟ وہ کیوں دکھی ہوتا؟ اپنے بزنس پارٹنر سے لڑ بھڑ کر اپنا دھندا چوپٹ کر لیتا؟ بس اسی سال میں رام اور سیتا کی طلاق نہایت صلح صفائی سے پٹ گئی اور پھر؟...... پھر رام نہ صرف سیتا اور راون کی شادی کے استقبالیہ میں خندہ پیشانی سے شریک ہوا بلکہ اس مبارک ساعت پر اپنی بیوی کو ایک گراں بہا موتیوں کا ہار اور اس کے شوہر کو سونے کے چین والی گھڑی تحفتاً پیش کی۔

کیوں؟ چلو بھر پانی میں کیوں ڈوب مرتا؟ پرانے وقتوں کے بے معنی محاورے مت دہراؤ بھائی۔ ڈوبنے کے لیے گہرا پانی اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ آج کل تو ہم خودکشی کا پکا ارادہ کر کے چپکے سے گھر لوٹ آتے ہیں کہ اس مغز کھپائی کی بجائے دو ٹاٹ چڑھا کر آرام سے سو جائیں...... ایسی زندگی سے موت بہتر ہے؟...... ہاں، ہے! پر جس کی موت پہلے ہی واقع ہو چکی ہو، وہ دوبارہ کیسے مرے؟...... کیا؟...... ہم مر چکے ہوتے ہیں تو جئے کیسے جاتے ہیں؟ جینے اور جینے میں بھی تو انتر ہوتا ہے۔ بس لاعلمی میں جئے جاتے ہیں...... نہیں، ایسا نہیں۔ میں بتاتا ہوں۔ میں اور میری بیوی ڈنر ٹیبل پر ساتھ ساتھ بیٹھے ایک دوسرے کے سوالوں کا باقاعدہ جواب دے رہے ہوتے ہیں۔ میں اس کی طرف یا وہ میری طرف چاؤ سے کھانے کی پلیٹیں بھی بڑھا رہی ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں بھی ڈال لیتے ہیں، مگر ہمارے ذہنوں پر کچھ بھی رجسٹر نہیں ہو پا رہا ہوتا، یعنی ہم کچھ بھی نہیں کر رہے ہوتے، بلکہ ہمارا کیا ہی ہمیں کر رہا ہوتا ہے...... ہاں بھائی، یوں ہی مرے مرے جئے جاتے ہیں۔ ہاں، کتنی اذیت ناک موت ہے؟ پر کانٹا چوبیس گھنٹے چبھا رہے تو چبھن بھی کہاں

محسوس ہوتی ہے؟ سو چپ سادھے پڑے رہتے ہیں...... ہاں، ہمارے سناٹے پر کان دھر لو، یا شور پر، وہ بھی بے معنی اور یہ بھی۔

نہیں بھائی میرے، جو اپنی موت پر واقعی دم توڑ دیتا ہے اور جس کا جسم ہم جلا پھونک آتے ہیں وہ ہمارے وجود میں آ ڈیرے ڈالتا ہے...... بے صبر کیوں ہوتے ہو؟ میں سمجھاتا ہوں...... رونا میں بالکل بھول چکا ہوں، پھر بھی کبھی کبھار میں خود کو روتے ہوئے پکڑ لیتا ہوں۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ میری مرحومہ ماں میرے مردے کو بھینچے ہوئے ہے۔ مطلب یہ کہ مرحومہ زندہ ہوتی ہے اور میں مردہ...... چپ میرے لعل، چپ!...... مت روؤ!...... ادھر دیکھو بیٹے میری آنکھوں میں...... لیکن میں اپنی مرحوم ماں سے آنکھیں چار کرنے سے گھبراتا ہوں کہ اسے خبر نہ ہو جائے وہ مُردے کے بھیتر رہائش اختیار کیے ہوئے ہے جس کے دل کی ٹک ٹک بس ایک خارجی پیس میکر کے باعث بند ہونے میں نہیں آتی۔

ہماری بلڈنگ کے پچھواڑے ایک پارک ہے بھائی۔ یہاں شو آسن، کی مشق کرنے کے لیے گجر دم سے ہی نوگ جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں...... شو آسن؟...... شو آسن یہ ہے کہ لاش کی طرح زمین پر بدن پسار کر پڑے رہو...... میں بھی یہ آسن کرنے کے لیے جاتا رہا ہوں۔ تم کیا جانو بھائی، مُردوں کو یہ محسوس کر کے کتنی راحت نصیب ہوتی ہے کہ وہ مر چکے ہیں؟...... جسم چت پڑا ہے اور سوچوں کی پوٹلی چھن چکی ہے اور کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا...... کوئی کامیابی، ناکامی، غصہ، بے چینی، غم یا خوشی...... کچھ بھی نہیں...... یہی محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا......

شاید جسے ہم جہنم کہتے ہیں وہ یہی ہے کہ موت کے باوجود ہم اپنے آپ کو ڈھیلا نہیں چھوڑ پاتے اور اپنے ادنیٰ پن کو بدستور جئے جانے پر اڑے رہتے ہیں...... نہیں؟...... نہیں کیوں؟...... سنو۔ پچھلے ماہ میرا ایک دوست چل بسا اور جس دم وہ بیدم ہوا اسی دم میرے سامنے عین بعین آ کھڑا ہوا۔

"گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ بیٹھو۔"

"میرے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں۔ میرا ایک کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں؟ کہو!"

”راجس سے کہنا، تم نے تو میری موت کا سامان صرف اس جہان میں کیا، میں تمہیں دو جہانوں میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میں اپنے اس دوست کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ سوچا، پہلے شراب سے اس کی تواضع کروں گا اور پھر جب اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو اسے ہر روز شو آسن کرنے کا مشورہ دوں گا، مگر میری کوئی سنے بغیر وہ منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے فوراً لوٹ گیا۔

ہاں بھائی، میں نے چاہا کہ اپنی بیوی کو بھی شو آسن کے لیے اپنے ساتھ لے جایا کروں...... آؤ!...... میں اسے دکھانے کے لیے فرش پر چت ہو گیا...... آنکھیں میٹ کر میرے ساتھ فرش پر ڈھیر ہو جاؤ۔

اس نے چلا کر مجھے جواب دیا۔ ”مجھے جیتے جی مرنا پسند نہیں۔ جب تک میرے ایک سانس بھی باقی ہے میں آنکھیں کھول کر جینا چاہتی ہوں۔“

اس بے چاری کو بھی کیا پتہ، کہ کب اس کی موت واقع ہو گئی۔ مردوں کی آنکھیں بند نہ کر دی جائیں تو وہ کسی بدروح کی طرح بھٹکتے رہتے ہیں۔

ہاں، ہم میاں بیوی ضرور ہیں مگر ہم نے شادی نہیں کی...... کیوں...... اس لیے کہ جب ہمیں اپنے اپنے ساتھ جینا بھی نصیب نہیں تو ہم جنم جنم ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسم کیوں کھائیں؟...... نہیں بھائی ہم اپنی اپنی زندگی کہاں جیتے ہیں؟ اگر جینے کا تہیہ کر لیں تو بھوکوں مریں...... میں ٹی وی سیریلز کا اسکرپٹ رائٹر ہوں...... ہاں، یہ سوپ اوپیرا رائٹنگ کرتا ہوں...... ہاں بھائی ہاں سال بہ سال صابن کا جھاگ بنائے چلا جاتا ہوں مگر میرے ہاتھ صاف ہونے میں نہیں آتے، لہٰذا وہ سیریل آگے ہی آگے چلتا رہتا ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ معلوم کروں سیریل کو کہاں جانا ہے۔ جہاں بھی جا پہنچے۔ جب مالکان کہتے ہیں، بس میں ہاتھ روک لیتا ہوں جن پر دھل دھل کر داغ اور واضح ہو جاتے ہیں...... کیا؟......

ہاں، ایک لڑکی نے بھی مجھے یہی بتایا تھا...... دھنپت جی آپ کا سیریل ”شہزادی کی موت“ پر پل پل کر میں نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا، مگر میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ نے مجرموں کی سازش میں شریک ہو کر آخر میں اسے قتل کروا دیا...... کون شہزادی؟ کس کا قتل؟...... پھر بھی میں خوش ہوں کہ میری جھوٹ موٹ کی رائٹنگ نے کسی معصوم کے سچ مچ کے غصے کا سبب پیدا کر دیا۔

میری بیوی؟...... میری بیوی ہی میرے سریلیز میں ہیروئن کا پارٹ ادا کرتی ہے......
ہاں، اس سیریل میں بھی وہی وہ شہزادی تھی جسے قتل کر دیا گیا، یعنی جو مری وہ کوئی تھی ہی نہیں...... مگر دھنی...... اس نے مجھے بتایا تھا...... میں نے واقعی بہت اچھا پارٹ پلے کیا۔ خود مجھے بھی یقین ہونے لگا تھا اب میں کسی صورت نہیں بچوں گی...... سوپ اوپرا کا یہی ایک کمال ہے کہ اِسے جتنا موٹا اور اونچا لکھوا تنا ہی یہ قابل یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔ جھوٹ موٹ کے لوگ آپ ہی آپ سچ مچ کی لاشوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ سچ پوچھو بھائی تو کشتوں کے پشتوں تلے دبے دبے مجھ سے اپنے ہونے کا احساس چھن چکا ہے۔ ہاں بھائی، میں کوئی ہوں ہی نہیں اور جب میں اپنی بیوی...... تمہیں کیوں اعتراض ہے کہ میں اسے اپنی بیوی کہتا ہوں...... جب میں اپنی بیوی کے ساتھ لیٹے ہوئے اس سے محبت کر رہا ہوتا ہوں تو اپنے اس بھوت ناک خلجان میں مبتلا ہونے لگتا ہوں کہ ایک آسیب ایک لاش کے جسم پر پھد کے جا رہا ہے...... ہاں کئی بار ایسے بھی ہوا کہ گھپ اندھیرے میں میرے لمس پر وہ بستر سے باہر اچھل گئی...... کیوں؟...... نہیں بھائی، لاشوں سے بھی یکلخت مخاطب ہو کر کہو...... سانپ؟...... پھر دیکھو وہ کیسے خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوتی ہیں...... بات خواہ مخواہ لمبی ہو گئی۔ کہنا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ دھندے میں اسٹارڈم کی للک میں میری ایکٹریس بیوی اپنی لاش سی ہو کر رہ گئی ہے اور میں......؟ میں نے اپنا قلم گھسا گھسا کر اپنا سارا وجود ہی گھسا دیا ہے۔ جس بے دریغی سے میں اپنے سیریلوں میں صابن کے پتلوں کو کڑکتے بادل اور بجلی میں سیلابوں کے سپرد کر دیتا ہوں اسے آسمانوں سے ملاحظہ کر کے ٹریجڈی کا گرینڈ اولڈ مین سیکا بھی دانتوں میں انگلی دبا لیتا ہے۔ یار، یہ تو ہمارا بھی استاد نکلا۔ نہیں، وہ تو میں نے اپنی ان کہانیوں کے بارے میں کہا تھا جو میں کبھی کبھار چھپنے کے لیے بھیجتا ہوں۔ ان کہانیوں کے کردار ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے میں نے بتایا تھا۔ اچھے، نہ برے۔ ہاں بس جعلی اور گھٹیا، مارتے بھی ہیں تو اتنا چپکے سے کہ مقتول کو قتل کے بعد ہی کان ہو پائیں ان کی ساری باہری کہانی یہی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے، کچھ مت کرو یا کچھ اس طرح کرو گویا سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا سوپ اوپیرا کوئی کیسے بنا سکتا ہے؟

نہیں بھائی، میرے ٹی وی سیریلوں کے آدرش وادی کردار موجودہ زندگی میں ہیں کہاں؟ اور اتفاق سے ہوں بھی تو اتنے احمق لگتے ہیں کہ سب سے پہلے اُنہی پر ہنسنے کو جی چاہتا

ہے۔ نہیں! ہاں! ان کی تصویروں کے سامنے تو ہم بڑی تعظیم سے سر جھکا لیتے ہیں۔ جانتے ہو لوگ میرے کرداروں سے اس قدر خوش کیوں ہیں؟ اس لیے کہ آدرشوں کی خاطر جب میرے کردار ہنسی خوشی سولی پر چڑھ جاتے ہیں تو لوگوں کو لگتا ہے کہ ان بے چاروں کی بجائے وہ قربان ہو گئے ہیں اور قربان ہو جانے کے باوجود سالم و ثابت ہیں...... نہیں، انہیں اپنا ادنیٰ پن دکھائی دینے لگے تو وہ ادنیٰ کیوں رہیں؟...... خورد و نوش سے سیر ہو کر وہ مزے سے کسی کھٹی میٹھی کرائے کی عورت کو پہلو میں دبا کے اپنا ٹی وی سیٹ کھول لیتے ہیں اور ایڈیٹ باکس میں جو سب سے مہان معلوم ہوتا ہے اسے پیچھے گرا کر خود آپ اس کی جگہ مرکز میں براجمان ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان کی جنسی اشتہا اور بھڑک اٹھتی ہے، حالانکہ کرائے کی عورت اب تک چڑ سی گئی ہوتی ہے...... اتنا ٹائم کیوں لے رہے ہو؟ جو کرنا ہے کر بھی چکو اور ہمیں چھٹی دو!

ہاں بھائی یہ لوگ سورگ بھوگتے ہیں اور نرک کیے جاتے ہیں۔ ہاں، میں بھی!...... ہر کوئی عین ہمارے سامنے ہوتا ہے مگر اپنی جلد کی چار دیواری سے نامعلوم کہاں غائب؟ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو بلانے کے لیے کسے بلایا جائے...... اسے؟...... اسے؟...... ماضی بعید میں جانے کی کیا ضرور ہے؟ میرے بچپن میں بھی...... بہت کم سہی پر جتنے بھی...... برے شفاف طور پر برے تھے اور برے برے اچھے لگتے تھے مگر اب سبھی بروں نے اتنا اچھا بہروپ بھر رکھا ہے کہ برا وقت آن پڑنے پر سب سے پہلے انہیں کی طرف دوڑنے کی سوجھتی ہے، پر دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کوئی اچھا آدمی اپنی اچھائی اور ولینی کو کام میں لا کر ہمارا بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے...... سو بھائی، ذرا سوچ کر مجھے بتاؤ کون اچھا ہے، کون برا؟...... یا کوئی ہے ہی نہیں؟ ایکٹروں میں ایکٹ کرنے والے تو ہوتے نہیں، وہی ہوتے ہیں جنہیں ایکٹ کیا جا رہا ہو...... یا پھر کیا واقعی وہ بھی ہوتے ہیں؟...... ان کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔

تو پھر بھائی، ہمارے آس پاس یہ جو حرکت اور زندگی کے آثار ہیں...... یہ قہقہے...... یہ آہیں، چیخیں، بھاگ دوڑ، رسہ کشی، ہانپ...... یہ سب کیا ہے؟ کوئی تو ہوں گے یا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے گرد و پیش دراصل ایک طلسمی سکوت طاری ہو اور یہ ساری صدائیں...... زندگی کے یہ سارے کھٹکے ہمیں خیالوں میں ہی سنائی دیتے ہوں...... کیا؟...... ہاں، سچ مچ بھی سنائی دیں تو جیسے بھی ہم ان کے بارے میں سوچ لیں وہ ہمیں ویسے ہی پیش آتے ہیں......

ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ پڑوس کے فلیٹ سے مجھے دھڑام دھڑام دیواریں گرنے کی آوازیں سنائی دیں اور میں بدحواسی میں دوڑ کر اس فلیٹ کے سامنے آکھڑا ہوا اور دروازہ پیٹنے لگا۔ اندر سے میری پڑوسی مسز پٹھو نے دروازہ کھولا تو وہ بڑے اطمینان سے مسکرا رہی تھی، مگر آوازیں اور بھی اونچی ہو گئی تھیں۔ میں دو قدم اور آگے ہو کے مسز پٹھو کے کندھوں سے اس کے بیڈ روم میں جھانکنے لگا جہاں ایک بہت بڑے ٹی وی اسکرین پر شاید کسی فیچر فلم میں کوئی بھونچال کا سین دکھایا جا رہا تھا۔ ذرا سا کان لگانے پر مجھے احساس ہوا کہ ہمارے فلور پر سبھی فلیٹوں میں زلزلہ آیا ہوا ہے اور مکین اتنے آرام سے بیٹھے تماشہ کیے جا رہے ہیں گویا انہیں پورا اطمینان ہو کہ خواہ سارا شہر منہدم ہو جائے ان کا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔

بھائی، میں شرمندہ سا ہو کے ساری کہہ کے مڑنے لگا تو مسز پٹھو نے مجھے ہاتھ سے اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیا...... آہی گیا ہے مسٹر دھنی، تو جانے کا کیوں مانگتا ہے؟ گھبراؤ نہیں۔ ہمارا اپٹھوں گھر میں نہیں...... ایک بار میں بھی اسے نشے میں اپنی بیوی سمجھ کر اپنے فلیٹ میں کھینچ لایا تھا...... نہیں، مجھے اس کے بیڈ روم میں داخل ہونے میں تامل کیوں ہوتا؟ میں تو اس کے شوہر کی موجودگی میں بھی جب چاہوں اس کے ایڈیٹ باکس سے برآمد ہو کر اس کے دل میں کھٹ کھٹ جا بیٹھوں۔

مسز پٹھو نے میرے سامنے وہسکی کی بوتل اور دو گلاس لا رکھے۔ ''اس فیچر فلم کے باد بڑا اچا ٹیلی فلم آ رہا ہے جس میں تمہارا اورت سالا ایک کے باد ایک سات مردوں کے ساتھ سوتا ہے۔''

''چھی، چھی ممی! ایسا گندا فلم اچھے ماں باپ نہیں دیکھتے۔''

لمبے چوڑے بستر کے دوسرے کونے کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا تھا جہاں اس کا پانچ چھ سالہ چھوکرا اگریوی اپنی نیند سے جاگ پڑا تھا۔

''وہسکی کے ساتھ سوڈا مانگتا مسٹر دھنی یا واٹر؟''

نہیں بھائی سوال یہ نہیں کہ فلم صرف فلم ہوتے ہیں، اس لیے عورت سات مردوں کے ساتھ سوئے یا چودہ کے ساتھ۔ سوال یہ ہے کہ اصل زندگی کیا فلموں سے بھی تگڑا جھوٹ نہیں؟ یہ جھوٹ ہم نہایت سچائی سے نہ بولتے چلے جائیں تو سیدھی راہ سے بھٹک جائیں۔ اپنی بیوی...... پھر وہی بات! تمہیں کیا اعتراض ہے کہ میں اسے اپنی بیوی کہوں؟ اپنی

بیوی مجھے اس لیے اس قدر پسند ہے کہ ہر جھوٹ بڑی جرات اور دیانت سے بول دیتی ہے۔ سننے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔ آج ہی صبح اس نے مجھے بتایا، کل ہنس راج سے میری بڑی لمبی چوڑی بات ہوئی ہے...... ہاں بھائی، وہی سفید سوٹ والا، جسے تم نے تھوڑی دیر پہلے یہاں کھڑکی سے دیکھا...... مجھے معلوم تھا کہ وہ، میری بیوی پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ پہلے تو اسے گھاس نہیں ڈالتی تھی مگر جب سے...... ہاں بھائی، وہ گھاس پھوس ہی کھاتا ہے۔ بڑا سٹرکٹ ویجی ٹیرین ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پودے ہماری طرح شعوری زندگی نہیں جیتے لہٰذا سبزیاں اور پھل کھالیں تو انہیں کیا پتہ؟...... ہاں، اسے بھی ویجی ٹیشن ہی سمجھو۔ اگر میں ویجی ٹیرین ہوتا تو اسے بڑی رغبت سے کھاتا۔ مگر میں تمہیں اپنی بیوی کا بتا رہا تھا۔ جب سے ہنس راج کی بیوی اس سے الگ ہوئی، میری بیوی اس پر بہت ترس کھانے لگی۔ ہاں، حالانکہ درخت اپنی موٹی چھال میں کوئی آزار محسوس نہیں کرتا...... خیر، قصہ یہ ہے کہ بالآخر اس کی اور میری بیوی کی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہنس راج نے ایک کروڑ پتی کو اپنی راہ پر لگا لیا تھا جس کی خواہش تھی کہ ہنس راج اور وہ دونوں مل کر اپنے گروپس آف انڈسٹریز کی طرف سے ایک نہایت طویل ٹی وی سیریل اسپانسر کریں مگر اس کروڑ پتی کی شرط ہے کہ سیریل کی کہانی کی ذمہ داری اس کی محبوبہ کو سونپی جائے۔ یہ سن کر میرا چہرہ تو لٹک آیا مگر جو ہے سو ہے ہی۔ ہنس راج خواہشمند ہے کہ میری بیوی اس سیریل میں ہیروئن کا رول سنبھالے...... مگر میری بیوی نے مجھے بتایا ہنس راج نے بھی ایک شرط عائد کر دی ہے۔ وہ چاہتا ہے خواہ میں تمہارے ساتھ رہتی چلی جاؤں، پر اس کے ساتھ شادی کر لوں۔

"شادی سے کیا ہو جائے گا؟"

"اسے ایک قانونی وارث کی ضرورت ہے۔'

"تو اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟" میں ڈرنے لگا کہ کہیں وہ اپنے اسکرین کیریئر کا اتنا بڑا موقع نہ کھو دے۔

"میں نے حامی بھر لی ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ایک ماہ تمہارے ساتھ رہ لیا کروں گی دھنی، اور ایک ماہ اس کے ساتھ۔"

تم کیسے آدمی ہو بھائی کہ جھٹ ہر کسی کو ڈوبنے کا مشورہ دینے پر اتر آتے ہو؟...... اور

پھر یہ بھی چاہتے ہو کہ تمہارے سامنے کوئی دل کھول کر رکھ دے۔ مجھے تو تمہاری آنکھوں سے یہ بھی لگ رہا ہے کہ تم میری باتوں پر باور ہی نہیں کر رہے...... نہیں بھائی، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ جب میں اپنی بیوی کو...... پھر وہی اعتراض...... جب میں اسے بھینچ کر سو رہا ہوتا ہوں تو دراصل خود کو ہی اپنے بازوؤں میں کسے ہوتا ہوں۔ وہ کوئی گوشت پوست کی نرم و گرم شے تھوڑا ہی ہے جسے گلے سے لگا کر پڑے رہیں۔ وہ میری، تمہاری طرح آج کی ایک شخص ہے، یعنی اپنا بھوت، جس کی طرف کوئی محبت سے لپک کر بڑھے تو خالی خولی ہوا سے گزر کر اس کے پیچھے دیوار سے جا ٹکرائے اور سر پھوڑ لے۔ ایک دفعہ اس نے بھی مجھ سے پوچھا تھا، دھنی، کیا تم کوئی بھوت ہو؟ تمہارے ساتھ سوئی ہوتی ہوں تو آنکھ کھلنے پر حیران رہ جاتی ہوں کہ اپنے آپ سے ہی لپٹی پڑی ہوں۔

کیا قیامت ہے بھائی! کیا یہ ہماری بیگانگی کا انعام ہے یا سزا؟ اپنے محبوب کو بانہوں میں لے کر بھی ہمارا اُس سے ملاپ نہیں ہو پاتا؟...... مگر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ قیامت کے روز مردے اپنے کورے جسموں سمیت جیوں کے تیوں اٹھ کھڑے ہوں گے۔

سوگ

روشن کی ماں کا ایک اور بھی بیٹا تھا مگر محلے والے اسے روشن کی ماں ہی کہہ کر بلایا کرتے تھے، پر کون ماں اور کون بیٹا؟ روشن تو پچھلے سال آج ہی کے دن اپنی جوان جہان کایا کا ڈھیر بلکتی ماں کے پہلو میں چھوڑ کر پرلوک جا سدھارا تھا۔

روشن کی ماں آج سویرے آنکھ کھلتے ہی جلدی سے غسل وسل سے فارغ ہو کر گھر کی بیٹھک خالی کرنے میں لگ گئی اور جب تک اس کی بہو نے اس کے بڑے بیٹے کستوری لعل اور بچوں کو ناشتہ کروا کے دفتر اور اسکول چلتا کیا وہ بیٹھک کے ننگے فرش پر صاف ستھری چادریں بچھا کر ایک کونے میں اکڑوں بیٹھ گئی اور محلے والیوں کا انتظار کرتے کرتے سوچنے لگی کہ دیاونتی کو کہیں دمے کا دورہ نہ پڑ گیا ہو، اس نے تو کہا تھا کہ وہ چولہا چوکا اپنی بیٹی کو سونپ کر اس کا ہاتھ بٹانے چلی آئے گی۔

اسی اثناء میں روشن کی ماں کی بہو اس کے لئے چائے اور رَسک لے کر آ گئی۔ "پورے دن کا رونا دھونا ہے بے بے، پہلے کچھ کھا پی لو۔"

"نہیں۔" روشن کی ماں نے چائے کی پیالی کو ہولے سے پرے جو جھٹکا تو تھوڑی سی چائے چھلک کر نیچے چادر پر گر گئی۔ "کلیجہ منہ کو آیا ہوا ہے بہو۔ کھایا پیا باہر اچھل آئے گا۔"

اس کی بہو نے نیم ناراضگی سے سر جھٹک دیا، جیسے یہ کہنے کے لئے، نہیں تو نہ سہی، اور ٹرے لئے واپس رسوئی خانے کی طرف ہو لی، اور روشن کی ماں، اپنے خون میں امنڈ امنڈ کر دل کی طرف، جہاں اس کا چھوٹا سا گول مٹول روشن ابھی ابھی اسکول سے بھاگ کر اچانک آ وارد ہوا تھا اور کاپیوں کتابوں کا بستہ ایک طرف پھینک کر روں ریں کرتے ہوئے بار بار اپنی نکر اونچی کر رہا تھا۔

"ڈھیلی ہے؟"

"نئیں۔"

"پھر بار بار اُپّر کیوں اٹھاریاں؟"

اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ ماسٹر جی نے مارا ہے۔

"کیوں؟"

"سکول دا کم نئیں کیتا سی۔"

"ہائے اوئے شیرا۔!" روشن کی ماں کے منہ میں ایک دم یہ بین جھول آیا کہ اس کا روشن تو اپنے سارے کام چھوڑ کے چلتا بنا۔ وہ اپنا وجود وہیں گرا کر آواز کو چھت پر چڑھانے لگی جسے سن کر دیاونتی باہری دروازے سے کچھ فاصلے پر ذرا سی رکی اور پھر تیز تیز کمرے میں داخل ہو کر ہانپتے ہوئے سیدھی اس کے سامنے آ بیٹھی اور خود آپ ہی اس کے سر کا دوپٹہ اپنے سر اور اپنے سر کا اس کے سر کی طرف کھینچ کر ایک بڑا سا گھونگھٹ لٹکا لیا اور اس کی ناک سے ناک جوڑ کر اپنے منہ میں اس مانند کلیجہ بھرنے لگی گویا اس پر دمے کا دورہ پڑ گیا ہو...... ہائے اوئے روشنا!...... اوئے تُو تے ماں نال جھگڑ کے سِدھا میرے پاس آ جاندا سی۔ ہائے دے، ماواں نہ سنیں تے چاچیاں کس کھاتر ہُندیاں؟...... ہائے پورا اک سال بیت گیا...... نی روشن دی مائے، نی نردھیے، روشن نوں کدھر چھپاِ تا ای؟......

اتنے میں محلے کی اور پانچ عورتیں دروازے پر نمودار ہوئیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں رونے دھونے کی ساجھ میں ساتھی کا فوری انتخاب کر کے اندر گھس آئیں اور دو دو ہو کے آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ مگر رام لبھائی نے جب دیکھا کہ اس کے سامنے شورانی بیٹھی ہے جو اسے کوسے بغیر اپنا دن شروع نہیں کرتی تو اس نے اونھ، کہہ کر دوسری طرف کسی اور سے منہ ماتھا جوڑ کے گھونگھٹ کی اوٹ بنالی، جس پر شورانی نے اکیلے ہی اپنا دوپٹہ چہرے پر لٹکا لیا اور روشن کی ماں اور دیاونتی کے سروں میں اپنا سر ملانے کے لئے سب سے پہلے شروع ہو گئی اور پھر سبھی دوسری بھی، اتنے جھٹ پن سے کہ روشن کی ماں کی بھوان کا واویلا سن کر رسوئی خانے میں اپنا ابلتا دودھ ویسے ہی چھوڑ کر بیٹھک میں دوڑی چلی آئی اور چُنی سے سر ڈھانپ کر وہیں ایک طرف بیٹھ گئی۔

"ہائے نی روشن دی مائے۔" دیاونتی روشن کی ماں کی سوچ میں اتار کھود رہی تھی تا کہ وہ بے روک ٹوک بہتی چلی جائے "نی کھوب کھل کے رو لے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"ہاں دیاونتیے۔" روشن کی ماں نے رو رو کر گاتے ہوئے اسے جواب دیا۔ "اب تو ٹھنڈی پڑ کے ہی چین آوے۔"

"شانت! شانت، روشن دی مائے!" دیاونتی نے تلقین کی اور بتایا کہ کوکھیں ماؤں سے الگ نہیں ہوئیں، وہ اپنے پتر کو آواز دے گی تو وہ دوڑا چلا آئے گا۔

"آ جا پترا، آ، میں سہرا باندھوں۔"

دیاونتی نے ماتمی لہک سے اس سے شکایت کی کہ وہ بڑی کھوٹی نکلی ہے، لڑکے کی ماں جو ہوئی۔

روشن کی ماں نے اپنی گائیکی میں پوچھا کہ اس نے کیا کیا ہے۔

"نی تیرا پتر میرا پتر۔ میرا پتر تیرا پتر۔"

"ہاں نی تیرا پتر میرا اوی۔" پر اس نے روشن کی ماں کو یاد دلایا کہ اس نے تو اس کی بہن کی بیٹی کے ساتھ روشن کے بیاہ کی زبان دے رکھی تھی۔

"ہائے دیاونتیے، میں کی کراں! میرا روشن ہی مینوں کھوٹا بنا گیا۔"

دیاونتی نے اپنی چیخ میں سر باندھ کر اسے کوئی جواب دینا چاہا مگر سینے میں گانٹھ پڑ جانے پر دمے کی مریضہ کی سانس اکھڑنے لگی اور شورانی موقع پا کر فوراً اس کی طرف گھسٹ آئی اور اس کے کان میں کہنے لگی کہ ذرا دم لے لے تاکہ وہ بھی روشن کی ماں کے ساتھ ایک باری لے لے۔

دیاونتی نے کھانسی دابتے ہوئے دیوار کے ساتھ پیٹھ جا ٹکائی اور شورانی نے روشن کی ماں کے سامنے آ کر اس کے دوپٹے پر اپنا دوپٹہ چڑھا لیا۔ مگر روشن کی ماں ابھی تک اپنی دھن میں دیاونتی کے گھونگھٹ میں ہی اپنا الاپ جاری رکھے ہوئے تھی۔ "ہائے نی دیاونتیے!"

"ہائے نی میں دیاونتی نئیں، میں شورانی نی۔ تیرے روشن دی ڈاڈھی چاچی۔"

"ہائے ڈاڈھیے۔" روشن کی ماں نے الاپ میں فریاد بھر کر اس سے پوچھا کہ اگر وہ اتنی ہی ڈاڈھی اور اڑیل ہے تو ڈھیلی کیوں پڑ گئی، ڈنڈا پکڑ کر روشن کو جانے سے روک کیوں نہ لیا۔

ہائے ڈاڈھیے!

روشن کی ماں کی بہو کو اپنا سورگیہ دیور بہت پیارا تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی پانی کھول رہا تھا، جیسے آگ پر بھڑ بھڑ ابلتا ہوا دودھ۔ "ہائے، دودھ میں تو چولہے پر ہی چھوڑ

آئی۔" وہ سرعت سے اٹھ کر رسوئی خانے کی طرف دوڑی اور جاتے ہوئے دروازے پر دو نووارد عورتوں کو چپل اتارتے دیکھ کر سوچنے لگی کہ شاید ماں کا بخار اتر گیا ہو تو وہ بھی آ نکلے۔ میں تو اسے پکا کر آئی تھی کہ ابھی پورا آرام کرے۔ کچھ ہو ہوا گیا تو اس کی دیکھ بھال کرنے والا کون ہے؟...... بھابی؟...... ہونہ! وہ میم صاحب تو صبح سویرے ہی اپنی دفتر کی بس میں چمپت ہو جاتی ہے...... ماں: ماں: کب تک نرک بھوگتی رہو گی؟ بھابی کو صاف صاف بول دو، اپنے بچوں کو خود آپ تیار کر کے جایا کرے...... آدھے سے زیادہ دودھ ابل ابل کر نیچے آگرا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے چولہے کی آگ بجھائی اور واپس بیٹھک میں آکر چپ چاپ اپنا وہی کونہ سنبھال لیا۔

"ہائے ڈاڈھیے!" روشن کی ماں کی گھگی بندھی ہوئی تھی اور وہ ڈاڈھی کو بتا رہی تھی کہ اس کا روشن پڑھائی پوری کرتے ہی پکا سرکاری نوکر بن گیا...... "ہائے نی، عمراں کچیاں تے نوکریاں پکیاں!"

"پھیر کی ہویا؟" ڈاڈھی نے اسے روک کر یاد دلایا کہ پہلے وہ اپنی پہلی بات پوری کر لے۔

روشن کی ماں اپنا سر اونچا کر کے اسے بتانے لگی کہ اس کا روشنا جب اپنی پہلی تنخواہ لے کر آیا تو اپنے سورگیہ باپ کو یاد کر کے رو دیا اور پوچھنے لگا، بے بے، اپنی پہلی تنخواہ باؤجی کو دے آؤں؟...... "ہائے اوئے روشن دے باؤدا، اوئے تُو تے چلا گیا سئیں۔ اپنی نشانی تے رہن دیندا......

روشن کی ماں کی بہو گویا ابھی تک چولہے پر جھکی ہوئی تھی کہ کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ باندھ لئے...... وہی گولی مول دُتی دُتی کے ملائم ہاتھ!...... چھوڑیئے! چھوڑیئے نا! آپ ہی تو ہیں!" روشن ٹھاٹھا ہنس پڑا۔ "بھابی، بھیا نہیں۔ میں ہوں!"...... ہائے میں کیسے جانو، تم ہی ہو؟...... میں تو سمجھی۔ یہی سمجھی، اُنہی کے ہاتھ ہیں!...... ہو بہو وہی!......

روشن کی ماں کی بہو ابھی ابھی چپ چاپ بیٹھی تھی اور اب یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور دودھ ابل ابل کر چولہے میں گرنے لگا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا شخص اپنے دکھڑوں کی پوٹلی الٹا پلٹا رہا ہوتا ہے تو پوٹلی کی گانٹھ ڈھیلی پڑنے لگتی ہے اور کونوں کھدروں سے کئی دکھڑے باہر آگرتے ہیں۔ روشن کی ماں کی بہو نے رونا تو اپنی آنکھوں پر بندھے

روشن کے گول مول ہاتھ ٹٹول کر شروع کیا تھا مگر پوٹلی ڈھیلی پڑ گئی تو اس کی آنکھوں میں برسوں پہلے کے اس لڑکے کی بھولی بھالی شکل گھوم گئی جس نے اس کے کنوار پن کے دنوں میں اس کے پیار میں مایوس ہو کر زہر کھا لیا تھا، یا شاید وہ اپنی کوکھ کے پہلے بچے کو بھی رو رہی تھی جو مردہ پیدا ہوا تھا اور جس میں جان ڈالنے کے لئے وہ اس کے منہ میں اپنی ساری سانسیں بھر دینا چاہتی تھی، یا پھر شاید اس کا دل صرف اس لئے بھر آیا تھا کہ اس کا پتی پچھلے کئی ماہ سے اس سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہا تھا، نامعلوم کیا کیا تھا، بہر حال اس کا رونا تھمنے میں نہ آ رہا تھا، جیسے اس کی ساس اور دوسری عورتوں کا بھی، مگر روشن کی بیوہ ماں اب روشن کی بجائے روشن کے باؤ کو یاد کئے جا رہی تھی، اور دیا ونتی کی سانس اب اپنے سورگیہ بھائی کی یاد میں اکھڑی ہوئی تھی جس نے تیس چالیس سال پہلے اسے پال پوس کر بڑا کیا اور بیاہا تھا، اور ڈاڈھی چاچی شورانی اپنی بیٹی جانکی کو اپنی گریاں آواز میں پروئے جا رہی تھی جس نے سسرال کے اتیاچار سے تنگ آ کر کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی اور ...... اور بس یوں لگ رہا تھا جیسے مردوں کے غول زندوں سے ملنے کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں اور بے اختیار گلے ملنے کا سماں بندھ گیا ہے۔ ہجر میں شاید ہم اسی لئے لگاتار روئے چلے جاتے ہیں کہ وصل کی تاب نہیں لا پاتے۔

روشن کی ماں کی بہو کا رونا تھما تو اس نے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے یونہی دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی، محلے کی بہری دادی وہاں دہلیز پر جوتی اتارتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے جا رہی تھی وہ سمجھ گئی کہ بہری دادی آج پھر اپنی بہو اور بیٹے مورتی سے جھگڑ کر آئی ہے۔ بہری دادی کو محلے والے صرف سنتے تھے اس سے کبھی کچھ کہتے نہ تھے، کچھ اس لئے کہ وہ بڑی غصیلی تھی، اور کچھ اس لئے کہ اپنی آواز کے سوا اسے کوئی اور آواز سنائی ہی نہ دیتی تھی، مگر اس کے بیٹے مورتی کا کہنا تھا کہ بے بے بڑی ڈھونگی ہے اسے سب کچھ سنائی دیتا ہے۔ ہم سب گھر والوں کو پاگل بنا رکھا ہے بوڑھیا نے ......

بہری دادی نے کمرے میں داخل ہو کر سب پر اچٹتی نظر دوڑائی اور پھر روشن کی ماں کے قریب آ کر ڈاڈھی چاچی کو دھکا دے کے پرے ہٹایا اور اس کی جگہ سنبھال کر فوراً اپنا بین الاپنا شروع کر دیا۔ "ہائے روشن دی مائے۔ نی پتر دی موت دا دکھ اوہی جانے جو پتر گنوا بیٹھے۔ نی آپی بھی رو اور مجھے بھی رلا۔"

سب عورتوں نے کان کھڑے کر لئے۔

روشن کی ماں نے اپنا الاپ اونچا کر لیا تاکہ بہری دادی سننے سے رہ نہ جائے، اور اس سے پوچھنے لگی کہ پتر تو میرا مرا ہے، تُو کسے رونا چاہتی ہے؟

بہری دادی نے رو رو کر اسے بتایا کہ اپنے موتی کو، اور کس کو؟ اور اپنی چیخوں کو سر میں باندھنے لگی۔ "ہائے نی میرا شیر جوان۔...... نی میرا سونا پتر...... نی میرے لکھاں کروڑاں!......" اُس کی تان یہاں پہنچ کر ٹوٹی کہ آج پھر "اُجڑ جانے" نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

سب عورتیں اطمینان سے اپنی رکی ہوئی سانس چھوڑ کر پھر سے رونے دھونے میں مشغول ہو گئیں۔

ڈبہ بند لوگ

میں نے روبی کو سڑک پر تیز دوڑانا چاہا ہے مگر حلق میں پٹرول کا فوارہ چھوٹنے پر اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہے اور وہ رفتار نہیں پکڑ پا رہی ہے۔

اپنی چھکڑا گاڑی روبی کو میں نے ہی یہ نام دے رکھا ہے۔ کئی سال پہلے جب میں نے اسے خریدا تو اس کا عہد جوانی پورا ہونے میں آ رہا تھا مگر اس کی کاٹھی ابھی کمزور نہیں ہوئی تھی اور تیور جوں کے توں تیکھے تھے، لہٰذا اس پر قابض ہوتے ہی میں آگا پیچھا دیکھے بغیر اس پر چڑھ آیا...... میں نے سوچا ہے کہ دھیرے دھیرے پٹرول دوں گا تو شاید روبی کو رفتار پکڑنے میں دقت پیش آئے۔ مجھے ڈر ہے کہ آج پھر وہ آکر چلا جائے گا۔ پچھلے ہفتہ بھی یہی ہوا...... نہیں، عام طور پر تو میں اس کے آنے پر گھر ہی میں ہوتا ہوں۔ وہ ہر منگل کے دن شام کے ٹھیک ساڑھے سات بجے پہنچ جاتا ہے۔ پچھلے ہفتہ بھی میرے باس نے دفتر کا ٹائم پورا ہونے کے بعد مجھے اپنے ساتھ کام میں جتائے رکھا۔ میں سنٹرل سول سپلائز آفس میں اکاؤنٹس آفیسر ہوں۔ اپنے باس سے میں نے لاکھ کہا، سر آج میرے یہاں کوئی آ رہا ہے، مگر باس میرا تو بس آدمی کی خالی خولی تصویر ہے۔ کوئی سچ مچ کا آدمی ہو تو اسے اوروں کے احساسات کا پاس بھی ہو۔ آج بھی اس نے مجھے چھ بج کر پچیس منٹ تک بٹھائے رکھا...... نہیں، اس ٹھیکیدار کا فائیل بھی چیک کر کے جاؤ...... سالا ٹھیکیداروں کے سرکاری فائیلوں کی اس طرح چھان پھٹک کرتا ہے جیسے اس کی بیوی انہی میں سے کسی کے ساتھ چمپت ہو گئی تھی...... سر، اگر آپ چاہیں تو میں کوشش کر کے بھابی کا اتہ پتہ نکال سکتا ہوں...... میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ شاید اسی بہانے اُس کی خوشنودی حاصل کر سکوں...... بھابی! کون بھابی؟...... سالا! بھابی نہ کہوں تو بیوی کہوں؟...... سر میرا مطلب ہے...... تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو...... یہی تو میں کرتا ہوں۔ دفتر کے بعد گھر میں ہر

وقت اپنی دو آنکھوں سے صرف ٹی وی پر کوئی فیچر فلم، ڈرامہ یا سیریل دیکھتا رہتا ہوں......
ہاں، ہمارے سرکاری دفتر تو اسی لئے چلتے ہیں کہ کوئی کام نہ ہو۔ ہونے لگے تو آدھے سے زیادہ دفتر بند ہو جائیں۔ میں اپنے سینئر اکاؤنٹس کلرک کے تصدیق کردہ حساب کتاب پر دستخط ثبت کرنے سے پہلے صرف یہی احتیاط برتتا ہوں کہ اس سے پوچھ لوں، کبھی اندر تو نہیں کروادو گے؟ سالا اس قدر کام چور اور بداحتیاط ہے، مگر گھونس کے دس فیصد کی رَٹ لگائے رکھتا ہے۔ کوئی پوچھے، بدہضمی کے مریض ہو، پہلے پانچ تو پچالو۔

اچانک مجھے اپنے آگے موٹر سائیکل پر ایک بانکا سا آدمی نظر آیا ہے جو ہو بہو وہی لگتا ہے جس سے ملنے میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ میں بڑی تیزی سے اس کے پیچھے چوک پر ٹریفک کی لال بتی کراس کر آیا ہوں اور میرے پیچھے اسی دم ایک ٹریفک کانسٹیبل نے اپنی موٹر سائیکل دوڑائی ہے اور میں نے گھبرا کر پہلے تو اس سے بچنے کے لئے گاڑی کو اور تیز کر دیا ہے اور پھر اور زیادہ گھبرا کر خود کو سپرد، کرنے کے لئے گاڑی روک لی ہے ...... نہیں! ہوا در اصل یہ ہے کہ میں نے چوک کی لال بتی پر اپنی گاڑی روکی ہے اور گرین لائیٹ کا انتظار کرنے لگا ہوں۔ ٹیلی فلمیں دیکھتے رہنے کے باعث میرے ساتھ یونہی ہوتا ہے، یعنی کچھ ہو، نہ ہو، مجھے یہی لگتا ہے کہ کوئی بڑی ڈرامائی صورت در پیش ہے۔ اس وقت بھی صورت حال یہ ہے کہ جسے آج میرے یہاں آنا ہے وہ ٹی وی سیریل "ایک مرد ہزار عورتیں" کا ہیرو ہے...... دا گریٹ شری کانت! بڑا نیک اور شاہ دل آدمی ہے۔ غریبوں کی جیبیں بھرتا رہتا ہے، مگر اس میں ایک یہی کمزوری ہے...... پر کمزوری کیوں؟ یہ تو کہانی میں اس کا رول ہے...... بہر حال جس نئی خوبصورت لڑکی سے بھی اس کا ملنا ہوتا ہے وہ پرانی کو یکسر بھول کر اسی کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ ایک چوکس لڑکی اسے گھما پھرا کے نفسیاتی امراض کے ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس کی ایکسپرٹ رائے تھی کہ اس میں شری کانت کا کوئی دوش نہیں۔ یہ ایک طرح کا مرض ہے جس سے محبوبہ کی پہچان اس کی ذات کی بجائے حسن سے انجام پاجاتی ہے، چنانچہ جو کوئی بھی حسین ہو، وہی وہ۔ مریض بڑی ایمانداری سے اسے ہی اپنی محبوبہ سمجھنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے میں بھی اس مرض کا شکار ہوں، حالانکہ مجھے ایسی کوئی واردات پیش نہیں آئی...... ہاں، شری کانت، منگل کے منگل عین ساڑھے سات بجے میرے یہاں پہنچ جاتا ہے...... نہیں!...... ارے نہیں! وہ بھلا سول سپلائز کے اکاؤنٹس آفیسر سے ملنے کیوں آئے

گا؟ میں ہی اس کے انتظار میں رہتا ہوں۔ "ایک مرد ہزار عورتیں" پچھلے ساڑھے چار سال سے ہر منگل کو ساڑھے سات بجے سے آٹھ بجے تک بالکمنڈ اینڈ بالکمنڈ ٹی وی چینل پر دکھایا جارہا ہے اور میں نے صرف شری کانت کی ایکٹنگ کی وجہ سے ان ساڑھے چار سالوں میں زیادہ سے زیادہ پانچ اپی سوڈمس کیۓ ہوں گے اور وہ بھی اس لیۓ کہ میرے باس نے مجھے دفتر میں رو کے رکھا...... سالا!......

ہاں، سالا، میرا تکیہ کلام ہے...... نہیں، میں اپنی اس عمر میں بھی غیر شادی شدہ ہوں۔ شادی شدہ ہوتا تو سالوں سے اتنی نفرت کرنے کی بجائے ان کے لئے تحائف اکٹھے کرتا رہتا، پر اپنا کوئی ہے ہی نہیں تو ساری دنیا مجھے سالوں سے بھری پڑی معلوم ہوتی ہے اور...... اور ہر سالے سے مجھے نفرت ہے۔ کوئی اپنی بہن کو میرے پلے باندھنے کی ٹھان لے تو اس سے محبت بھی کروں......

نہیں، ٹھہریۓ! کوئی ڈھائی سال پیشتر ایک بھائی نے اپنی بہن کا پلو میرے پلو کے ساتھ باندھنا چاہا تھا...... نہیں، وہ اس کا سگا بھائی تھا نہ سوتیلا۔ وہ دراصل منہ بولے بھائی بہن تھے۔ دونوں میرے آفس میں ہی کام کیا کرتے تھے۔ آدمی شادی شدہ تھا اور عورت، بیوہ۔ عورت کے شوہر نے خودکشی کرلی تھی مگر افواہ یہی تھی کہ اسی نے اپنے مرد کی جان لی ہے۔ بہر حال بھائی کے بھائی چارے کا بھانڈا پھوٹا تو اس کی بیوی ایک روز اپنے نصف درجن بچوں کے ساتھ دفتر آ پہنچی۔ بھائی نے سوچا ہوگا کہ میں جان پہچان کا آدمی ہوں۔ اس مانند بہن سے معاملہ بنا رہے گا، سو اس نے میرے اور اس کے سات پھیرے کروا دینا چاہا...... سالا!......

ارے نہیں، بابا! پچھلے ہفتہ وہ کیا ٹیلی فلم آئی تھی؟...... راکھی بندھن!...... یہ واقعہ میں نے اسی فلم سے سنایا ہے۔ ہمارے آفس میں تو سبھی مردوۓ ہیں۔ دو چپڑاسیوں میں سے صرف ایک اپنی مائی ہے، مگر یہاں محبت اور سازش کی بھلا کہاں گنجائش ہے۔ یہ ساری گنجائشیں تو صرف کسی مووی میں ہی میسر ہوں تو ہوں...... نہیں کیوں؟ ٹی وی نے تو یہ کھل کھیلا ہے کہ اور تو اور، ہماری مائی بھی دفتر کے کاغذ ایک میز سے دوسری تک اس طرح گھماتی پھراتی ہے جیسے شری کانت کی گود میں چلتے پھرتے آنکھیں مٹکا رہی ہو...... شری کانت!...... میں نے گھڑی دیکھی ہے...... پونے سات!...... میں نے اَیکسیلریٹر پر پاؤں دبایا ہے جس پر

بوڑھی روبی نے کھانس کر بلغمی دھواں چھوڑا ہے اور سرپٹ بھاگنے لگی ہے۔

پچھلے ہفتہ کا اپی سوڈ تو میں نہیں دیکھ پایا تھا، مگر اس سے پہلے کے اپی سوڈ میں شری کانت بڑی مشکل میں الجھ گیا تھا۔ حسب عادت وہ اپنی ایک نئی محبوبہ کے ساتھ گزر بسر کر رہا تھا کہ پچھلی اسکے بچے سے ہو گئی اور شری کانت کے سر ہو گئی کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ شری کانت غریب کو کیا معلوم کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ آئے دن کوئی نہ کوئی عورت اس کے تعلق سے اناپ شناپ بک جاتی ہے۔ وہ اکثر سنی ان سنی کر دیتا۔ دکھیا ہیں، کچھ کہنے سننے سے اور دکھی ہوں گی ...... کئی دوست ہنسی مذاق میں اسے مشورہ دیتے: بڑے خوش قسمت ہو کانت ...... تمہیں اور کیا چاہیے؟ ہر ایک سے شادی کر کے اسے طلاق دے دو ...... چھٹی! ...... وہ انہیں سنجیدگی سے جواب دیتا، ان سے شادی کرنے کے لئے میں اپنا آپ کہاں ڈھونڈوں؟ اوروں کی اداکاری کر کر کے اپنا آپ کہیں بھائی نہیں دیتا ...... جیسے بھی ہے وہ ان عورتوں کو موٹی سے موٹی رقم کا چیک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، مگر یہ عورت دہائی دینے لگی، ہمارا بچہ ...... میری سچی محبت کی نشانی ...... میرے پیٹ میں ہاتھ پیر مار مار کے روتا رہتا ہے۔ اسی پر رحم کھاؤ اور مجھے اپنے گھر میں ڈال لو ...... مگر میں تو خود آپ ہوٹل میں رہتا ہوں، گھر کہاں سے لاؤں؟ ...... شری کانت نے اسے بڑے دھیرج سے سمجھایا، بے چاری ننھی سی جان کو پیٹ میں کیوں قید کر رکھا ہے؟ اسے آزاد کر دو اور ...... اور جتنا پیسہ درکار ہے مجھ سے لے لو اور کسی بھلے آدمی سے شادی کر کے چین سے اپنی گھر گرہستی چلاؤ ...... اس تنے تنے لحظے میں میرے ذہن میں کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے، ایک کمرشل بریک کے لئے! ...... آپ کے نئے گھر کے لئے بنا سود قرضہ ...... مائی فٹ! بنا سود قرضہ! میں نے تو اپنے وَن بیڈ روم فلیٹ کا قرض اتارنے کے لئے ساری زندگی گروی رکھی ہوئی ہے۔

میں نے کئی دفعہ نوکری چھوڑ کر ایکٹر بننے کی سوچی ہے میرے اکاؤنٹس سیکشن کے کلرک کہتے ہیں، اجوانی جی، آپ کیا شری کانت سے کچھ کم ہیں؟ ایک بار ہاتھ مار کر تو دیکھئے۔ ٹیلی ویژن انڈسٹری میں دھماکا ہو جائے گا ...... مگر میرے باس کو میرے شوق سے چڑ ہے۔ میں اپنی دھن میں کچھ کہنے جا رہا ہوتا ہوں تو وہ مجھے بے رحمی سے ٹوک دیتا ہے ...... ”نو، مسٹر اجوانی، ایکٹنگ مت کرو اور کام کی طرف دھیان دو ...... سالا!

ایکٹنگ سے مجھے یاد آیا ہے کہ ہماری کالونی میں ایک ماڈل گرل رہتی ہے، مس والیا۔ اسے پوچھنا صرف یہ ہوتا ہے، کیا آپ بھی یہیں رہتے ہیں، مگر لگتا ہے جیسے وہ کہہ رہی ہو، دیکھئے میری ساڑھی کتنی خوبصورت ہے! اس کی قیمت صرف دو ہزار پچپن روپے ہیں۔ اگر لینی ہے تو ابھی اتارے دیتی ہوں...... بولیے!...... اس سے بات کرتے ہوئے میری تو بولتی بند ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ بوکھلاہٹ سے میرے منہ سے نکل گیا، چلیے!...... اس نے خوشی سے اچھل کر جواب دیا، نہیں آج نہیں، آج مجھے کسی اور کے ساتھ جانا ہے۔ اگلے اتوار کی رات کو میں آپ کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں گی۔ میں نے نا معلوم کیا کہنا چاہا مگر وہ مجھے ٹوک کر بولی، گھبرایئے نہیں، میں آپ کا فلیٹ نمبر ڈھونڈ لوں گی...... اور آپ حیران ہوں گے وہ واقعی آ گئی۔

نہیں بھائی، جی ہی جی میں تو کسی عورت کے ساتھ پوری رات بتا لیتا ہوں، پر مجھے معلوم ہی نہیں کہ سچ مچ آگے بڑھ کر کسی عورت کا ہاتھ بھی کیسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ اس اتوار کو چوکیدار سے کہہ کر میں نے سر شام ہی اپنے فلیٹ کے باہر قفل لگوا دیا اور خود اپنے بیڈ روم میں ٹی وی پر وائس کا والیم بند کر کے کوئی نہایت گرم اور لچر قسم کی امریکی فیچر فلم دیکھتا رہا۔ آپ کو کیا بتاؤں، اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں تارے ٹوٹتے رہے اور اسی حالت میں مجھے نیند آ گئی اور ٹی وی ساری رات بدستور کھلا رہا، اور صبح کو جب میری نیند ٹوٹی تو ٹی وی سکرین پر چند ناریاں اجول دھوتیوں میں آدھا مکھن بدن لپیٹے اور بال کھولے اپنے دھار مک بھجن کی لے پر بے سدھ ناچ رہی تھیں، مانو بھگوان کی جنسی خواہشات ابھر آنے تک دم نہ لیں گی۔

اپنے شری کانت کو ہی کسی فلمی کرشن کتھا میں دیکھ کر میں اسے پہلی نظر میں پہچان نہ پایا تھا۔ اِتنا ٹاپ لگ رہا تھا جیسے اصلاً گیتا رچیتا ہو...... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی وہی ہو اور وہ بھی؟ وہ خود آپ کیا ہے؟...... یہ جاننے کے لئے میں نے اسے ایک طویل خط بھی لکھا تھا جس کے جواب میں اس نے ایک چھپے ہوئے گریٹنگ کارڈ پر مجھے اپنی چھپی ہوئی نیک خواہشات بھیج دیں اور بس...... میں واقعی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ خود آپ کیا ہے۔ آج راجہ بن جاتا ہے، آج رنک یا جو بھی۔ وہ ہے کون؟ اور کیا؟...... ہم وہی ہوتے ہیں جو کرتے ہیں...... کیا کرتے ہیں؟ میں تو جو بھی کرتا ہوں اسے کرنے کا ڈرامہ کر رہا ہوتا ہوں...... اسی

لئے کوئی شخص تم سے ملتے ہوئے تم سے نہیں مل رہا ہوتا، کسی سے بھی نہیں مل رہا ہوتا......
کیا واقعی!...... ہاں، تم ایک صفر ہو۔ کوئی واقعی ہے تو صرف اوپر والا...... میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا سوچے جارہا ہوں لیکن اپنی سوچ سے مرعوب ہو کر اپنا آپ مجھے اہم معلوم ہو رہا ہے۔ صرف ایک اوپر والا وہی ہے جو وہ ہے۔ تمہارا اور میرا اور شری کانت کا کیا شمار؟...... اب یہ اور اب یہ اور اب...... میری ذہنی رو کو یکبارگی ایک کمرشیل بریک نے ٹھہرا لیا ہے:

کیا آپ اپنی ذات کا آگا پیچھا جاننا چاہتے ہیں؟
معمولی فیس پر ہماری جیوتش ودیا کا چمتکار

میں مسکرانے لگا ہوں اور پتہ نہیں کتنے پل مسکرا مسکرا کر کب اپنے آپ کو جالئے ہوں...... بھیس بدل بدل کر کسے یاد رہتا ہوگا کہ وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ کس سے ہے؟...... کتنا عجیب ہے! میں نے اپنے باپ کا نام یاد کرنے کے لئے دماغ پر زور ڈالا ہے...... ہاں، اور کیا؟ اسی لئے تو کسی کڑی صورتِ حال میں ہم سامنے والے کو ہی باپ بنا کر کام چلا لیتے ہیں۔ ہیڈکوارٹرز نے جب میرے فلیٹ کے قرض کی پہلی درخواست رد کر دی تھی تو میں ہاتھ باندھ کر اپنے باس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ کچھ کیجئے سر، آپ ہی میرے مائی باپ ہیں اور میرے باپ نے میری بے چارگی کا مذاق اڑاتے ہوئے میری درخواست پر اس طرح رک رک کر سفارش کے دو لفظ لکھے تھے جیسے اسے بگڑے بیٹے کو وراثت کا فلیٹ سونپنے میں تامل ہو...... سالا!......

مگن بھائی پراپرٹی ڈیلر...... میری دائیں جانب روڈ ڈیوائیڈر پر ایک کاروباری بینر میری آنکھوں میں آگھسا ہے۔ میں نے جھلا کر اسے بھول جانا چاہا ہے مگر ہر چند گز کے فاصلے پر وہی بینر از سر نو سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور میں سوچنے لگا ہوں، ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ اپنا لگژری فلیٹ میں فروخت کیوں نہ کر دوں؟ قرضے کا سود ملا کر ایک لاکھ تین ہزار کا پڑا تھا، جس میں سے ماہانہ قسطوں میں پینتالیس ہزار ادا ہو چکے ہیں...... اب کے میں نے مگن بھائی پراپرٹی ڈیلر کا ایڈریس پڑھنے کے لئے بینر کی طرف بغور دیکھا ہے...... بیچ دوں تو آج کے بھاؤ میں سات سوا سات لاکھ تو کہیں گئے ہی نہیں۔ یہ سارے پیسے کہیں بنک میں جمع کروا دوں گا اور نوکری وو کری چھوڑ چھاڑ کے مزے سے سود کے پیسوں پر جیوں گا۔ کچھ بھی

نہ کروں گا۔ دن رات کچی مونگ پھلی پھاڑ پھاڑ کر اس کا دودھ چوستا رہوں گا اور ٹی وی دیکھتا رہوں گا...... مگر گھر ہی نہ رہا تو کہاں بیٹھ کے دیکھوں گا؟...... اپنے بدن میں؟...... میں نے سیدھا بیٹھ کر آنکھیں اپنی لہو بھری ناڑیوں میں گھمائی ہیں اور اپنے بھیتر اپنے آپ کو کہیں نہ پاکر بوکھلا کے باہر نکل آیا ہوں اور پچھلی سیٹ پر سے اپنی گاڑی روبی کی ہنسی کی آواز سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے ہیں، باڈی میں تو صرف باڈی کے پرزے ہوتے ہیں اجوانی جی...... نہیں، روبی کو پچھلی سیٹ پر عین بعین بیٹھے پاکر مجھے کبھی تعجب نہیں ہوتا...... نہیں، اسے پہلی بار اچانک دیکھ کر تو میں نے خوف سے چلتی گاڑی سے کود جانا چاہا تھا، مگر اب اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ اسے موجود نہ پاکر سناٹے سے دم گھٹنے لگتا ہے...... مگن بھائی پراپرٹی ڈیلر کے آخری بینر کو پیچھے چھوڑ کر میں نے اپنے آپ کو فیصلہ کن لہجہ میں بتایا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے، گھر کبھی نہیں بیچوں گا...... مگر...... نو! نو! کہاں بیٹھ کے ٹی وی دیکھو گے؟ اور ٹی وی نہ دیکھا تو اور کرو گے کیا؟ کچھ کر گزرنے کی خواہش میں اسی طور پوری کرتا ہوں کہ ٹی وی کے سامنے بستر پر لیٹے لیٹے گویا قصے کہانیوں میں سبھوں کا کیا دھرا میں نے تن تنہا انجام دیا ہے، ساری دنیا میرے ہی سر پر سوار ہے۔ آفس میں اپنے چوبی کیبن میں بھی میں اکثر کچی مونگ پھلی کا دودھ چوستے ہوئے اپنی ذہنی آنکھ ایڈیٹ باکس پر جمائے ہوتا ہوں۔ میری میز کے آس پاس مونگ پھلی کے چھلکوں کا ڈھیر بکھرا ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں بعض اوقات میرا باس دفعتاً میرے کبوتر خانے میں آدھمکتا ہے اور اپنا کام بھول کر بے وجہ ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے...... مونگ پھلی کھانی ہو تو باہر جا کے کھایا کرو مسٹر اجوانی...... آپ کہیں گے سر، سانس بھی باہر جا کر لیا کرو...... نہیں، ایسا میں اس سے صرف دل ہی میں کہہ پاتا ہوں...... آئی ایم ویری ساری سر!...... مائی!...... وہ مائی کو میرے کیبن کا فرش صاف کرنے کی ہدایت کر کے کھٹ کھٹ باہر نکل جاتا ہے۔

مائی عمر میں تیس پینتیس سے زیادہ نہ ہو گی۔ نا معلوم ہم اسے مائی کیوں کہتے ہیں۔ اس کے میلے میلے کسے ہوئے چہرے پر ترشے ہوئے کھچڑی بال بکھرے رہتے ہیں جنہیں وہ پورا سر گھما کر عین مین اس مانند جھٹکتی ہے، جیسے ٹیلی ایڈز میں بالوں کا تیل بنانے والی کسی کمپنی کی کوئی اشتہاری عورت۔ مائی کی گیسوئی جھٹک پر میرے منہ سے اکثر واہ چھوٹ جاتی ہے اور جواباً وہ مسکرانے لگتی ہے اور مسکراتے ہوئے اسکے گالوں میں مبہم سے دلپذیر گڑھے ابھر

آتے ہیں اور میں ایک بار اور کہہ اٹھتا ہوں، واہ!...... آپ سے کیا پردہ؟ کبھی کبھی میں اسے آفس ٹائم کے بعد آفس سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک پنواڑی کی دکان پر ملنے کو کہتا ہوں اور اس پیاری سی چھکڑا مائی کو اپنی چھکڑا گاڑی میں بٹھا کر اپنے لگژری فلیٹ میں لے جاتا ہوں اور......

اور...... آپ بار بار بھول جاتے ہیں۔ میں آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ میں جو بھی کرتا ہوں ایک دل ہی دل میں کر پاتا ہوں...... نہیں، جرأت کی بات نہیں ہے۔ مجھ میں اچھا یا برا۔ کچھ بھی کرنے کی سکت ہی نہیں۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ من آنے پر خیالی طور پر جس عورت کو چاہو، ہاتھ پیر ہلائے بغیر اسے بے خطر اڑا لے جاؤ۔ اسے سچ مچ اڑا لے جانے کی مشقت اور صعوبت کون جھیلے؟

میں نے ایک مدت سے اپنے باس اور مائی کی اسٹوری کا ایک فسٹ کلاس پلاٹ گھڑ رکھا ہے۔ مائی کو میں غیر واضح اشاروں میں ترغیب دیتا رہتا ہوں کہ وہ باس کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ ابھی ابتداء ہے۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو ایک روز وہ اپنی بیوی کے فراق میں بے اختیار مائی کی گود میں آ پناہ لے گا۔ مائی بھی اکیلی ہے اور ایک کائیاں ہے۔ دھیرے دھیرے اگر میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تو سالے سے بیاہ کر کے اس کے گھر بار پر جا قابض ہو گی۔ اول اول شاید وہ جھجک سے کام لے گا لیکن اِن موقعوں کے لئے مائی کو میں ایسی بھرپور سپیچ کی ڈریس ریہرسل کروادوں گا کہ بڑے سے بڑا فلم ڈائرکٹر بھی منہ دیکھتا رہ جائے...... میرا کیا دوش ہے سر جی؟...... یہی نا کہ میں غریب ہوں۔ غریبوں کو کیا پیار کرنے کا اختیار نہیں سر جی؟ میں اپنا سب کچھ آپ کو سونپ چکی ہوں، اپنی عزت بھی، جو غریبوں کو سب سے پیاری ہوتی ہے۔ میرے پاس دھن ہوتا تو وہ بھی سارے کا سارا آپ پر نچھاور کر دیتی سر جی!...... سالا نامرد نہیں، تو مائی اسے آسانی سے اپنے جال میں پھانس لے گی اور پھر۔ پھر دونوں کے بیاہ کے بعد مائی سے کہہ کے اسے زہر دلوادوں گا اور خود آپ مائی سے بیاہ رچالوں گا...... ہاں، اور کیا؟ کروں دھروں سب میں، اور ساری دولت سمیٹ کر راج اکیلی مائی کرے؟...... نہیں، بھائی، سالے باس کا کاشانہ نکلا تو آگے کے سارے اپنی سوڈر کے رہ جائیں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں، بھاؤ نا سے کر تو یہ اونچا ہے۔ اگر کسی مَردوئے کے مرنے سے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے تو ہنسی خوشی اسے مرنے دیجئے...... میں تو سالے کی موت پر لڈو بانٹوں گا۔

آدمی ہے نہ جانور، درمیان کی کوئی زہریلی شئے ہے جسے اسی دم تھوک نہ دیا جائے تو سارا زہر دماغ کو چڑھ جاتا ہے۔ بڑا پارسا بنا پھرتا ہے، مگر اپنے اکاؤنٹس آفیسر سے بیر رکھ کر وہ بھی کیسے سلامت رہ سکتا ہے...... سالا!...... آگا پیچھا دیکھے بغیر جو بھی منہ میں آئے بک دیتا ہے۔ ارے منہ تو سبھوں کے ایک جیسے ہیں۔ اپنا بھی منہ ہلاؤ، اوروں کے بھی برابر ہلنے دو۔ اِتنا ڈھیر سارا پکوان اکیلے ہی کیسے ہضم کروگے؟ پرسوں میں چوہدری ٹھیکیدار کے ساتھ اپنے کیبن میں سارے سٹاف کی طرف سے معاملہ طے کر رہا تھا کہ منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے آنکلا اور دھمکانے لگا کہ کھڑے کھڑے ڈسمس کروادوں گا۔ سب کے سامنے اپنے ایک سینئر آفیسر کی پگڑی اتار کر پیروں میں پھینک دی۔

نہیں، میں پگڑی نہیں پہنتا، مگر آپ جانتے ہی ہیں، سر کے اندر تو ہر کسی نے پگڑی کا طرہ چھوڑ رکھا ہے۔ کس کو اپنی عزت عزیز نہیں ہوتی؟...... او۔ وا! نہ جانے کون دستار بند بوڑھا کہاں سے سڑک کے بیچوں بیچ میری گاڑی کے سامنے آگیا ہے۔ وہ تو میں نے اچانک دیکھ لیا اور سراسیمہ روبی خلاف توقع بریک لگتے ہی بلغمی دھواں چھوڑ کر جھٹکے سے کھڑی ہوگئی، ورنہ بوڑھا اب تک اپنی پگڑی اوپر والے کے قدموں میں ڈالکر بے تحاشہ فریاد کر رہا ہوتا اور اوپر والا ایک آنکھ میچ کر اشارے ہی اشارے میں مجھ سے پوچھ رہا ہوتا، بولو، دو ہزار سے کم میں معاملہ نہیں پٹے گا؟...... وہ بوڑھا اپنی کھلی پگڑی کو گلے میں لپیٹتے ہوئے کھڑا ہو رہا ہے اور چند راہگیر سڑک کے کنارے جمع ہوگئے ہیں اور اس سے پہلے کہ اور بھی جمع ہو جائیں، میں نے اپنی بوڑھی روبی کے ٹھنڈا ہو جانے سے پہلے اسے اسٹارٹر پر زور سے جھٹک کر پیروں پر مستعد کیا ہے اور میرے ایکسیلریٹر پر پاؤں دباتے ہی اس نے جو خوف سے کھانس کھانس کر دوڑ لگائی ہے تو مجھے پیچھے سے سنائی دیا ہے، چھوڑ و پیسے ہوئے ہے۔

میرا معمول ہے کہ رات کا کھانا بھی صبح ہی کو تیار کر کے دفتر جاتا ہوں اور شام کو گھر لوٹ کر کھانا گرم کرنے سے پہلے وہسکی کی بوتل اور کچی مونگ پھلی اور رنگین ٹی وی کا ڈبہ کھول کر صوفے پر ڈٹ جاتا ہوں۔ آفس سے گھر جاتے ہوئے میں کبھی کہیں راستے میں رک کر شراب نہیں پیتا...... ہاں، گھر پہنچ کر شراب پینے کے متوقع لمحات کو دل و جان سے جی رہا ہوتا ہوں، مگر صرف سوچنے سے نشہ تھوڑا ہی چڑھ جاتا ہے۔ شراب کے بارے میں سوچتے تو وہ بھی ہیں جنہیں شراب سے نفرت ہو، مگر نہیں، شراب پینے کی توقع شراب پینے

سے زیادہ نشہ آور ہوتی ہے، لہٰذا اگر چہ مجھے حادثہ پیش آنے پر میرا نشے کی حالت میں ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا، تاہم سچائی یہی ہے کہ آفس سے گھر جاتے ہوئے میں دھت نشے میں ہوتا ہوں...... نہیں، اس حالت میں بھی میں اپنی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو کنٹرول سے باہر نہیں ہونے دیتا۔ اکاونٹس آفیسر میں کوئی چوبیس گھنٹے میں تو نہیں بن گیا۔ کئی سال مار کھا کھا کے اس رتبے تک پہنچا ہوں۔ ماتحتوں کے حساب کتاب پر میں بظاہر آنکھیں بند کیے، دستخط ثبت کردیتا ہوں، پر حساب میں کوئی گڑبڑ جھالا ہو تو ہند سے میری ٹیڑھی نظر میں اٹک کر فوراً گڑ بڑ پیدا کرنے لگتے ہیں...... اسی طرح میں نے روتے دھوتے، آنکھیں ملتے ہی ہنسنے کھیلنے کا، اپنے سارے سکھوں کا سامان کیا ہے۔

روبی بدستور پولس حراست کے خوف سے ہچکیاں بھرتی ہوئی تیز تیز دوڑے جارہی ہے۔ میں نے اس کی رفتار کو کم کرنے کے لئے بریک پر پاؤں دبایا ہے، مگر بدحواس بوڑھیا کی رفتار آہستہ نہیں ہو پارہی ہے۔ میں نے پھر بریک لگایا ہے۔ شاید بریک کام نہیں کر رہا۔ میں گھبرا گیا ہوں اور ایک بار پھر لگایا ہے...... پھر ...... اور شکر ہے کہ بالآخر ہانپ ہانپ کر اس نے رفتار ڈھیلی کرلی ہے...... کل سب سے پہلے یہی کام کروں گا کہ بریک کسوالوں، مگر کیا کیا کسواؤں؟ روبی کا وقت ہی آپہنچا ہے...... میں کچھ کر کرا تو نہیں سکتا مگر سوچیں مجھے عجیب و غریب سوجھتی رہتی ہیں۔ شاید میں واقعی نشے میں ہوں...... کیا روبی جانتی ہے کہ اس کا وقت آن پہنچا ہے؟ انہی دنوں ایک دفعہ اسی طرح سڑک پر ہانپتے کانپتے جارہی تھی کہ حسبِ عادت پچھلی سیٹ پر آبیٹھی اور منت سماجت کرنے کے انداز میں بولی، مجھے اب ٹھکانے کیوں نہیں لگادیتے؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو موت کے بعد بھی مجھے چلائے جارہے ہو؟...... ہاں، موت کا سانحہ تو یہی ہے کہ مرنے والے سے کچھ ہو ہوا نہ سکے، اور جو ہو رہا ہو وہ اس سے قطع نظر ہوتا رہے۔ وہ خود آپ زندگی کو نہ اٹھا رہا ہو، بلکہ زندگی ہی ہانپ ہانپ کر اسے کندھا دیئے ہوئے ہو...... میں بھی کیا زندہ ہوں؟ میں نے بھی کیا اپنی موت کے بعد سارے روگوں کو زندہ رکھنے کا وطیرہ تو اختیار نہیں کر رکھا؟ یہ اتنے سارے لوگ جو اس سڑک پر چل پھر رہے ہیں کیا یہ اپنے اپنے جسم میں موجود ہیں، یا ان کی روحیں کبوتر ہو چکی ہیں؟...... شراب پینے کے بعد مجھے نشہ چڑھنے میں نہیں آتا، مگر شراب کی خواہش سے بدمست ہو کر میری ستی گم ہو جاتی ہے...... انسان تو پورے کا پورا مر کر بھی یہی چاہتا ہے کہ

سانس لیتا رہے، اپنی موت ہنسی خوشی جیتا رہے، مگر مشین کتنی انسانی ہے۔ ایک ذرا ناکارہ ہوتے ہی پرزہ پرزہ ختم ہو جانا چاہتی ہے...... میرے کانوں میں چوہدری ٹھیکیدار کا قہقہہ کسی پٹاخے کی طرح پھٹا ہے...... آگے آگے دیکھنا اجوانی بابو، نیک بخت مشینیں پانچ وقت کی نماز پڑھا کریں گی اور بد بخت انسانوں سے کچھ بھی نہ ہو پائے گا تو وہ دیکھا کریں گے کہ مشینیں کب ان میں پٹرول بھروا کر انہیں جہنم کے دروازے پر لا چھوڑتی ہیں۔

شری کانت!...... میں نے ہڑ بڑا کر گھڑی دیکھی ہے۔ سات بج کر دس منٹ ہو چکے ہیں۔ ابھی تقریباً پندرہ منٹ کا راستہ ہے...... مہانگروں میں فاصلے کتنے لمبے ہوتے ہیں!...... آدمی اور آدمی میں فاصلہ...... نہیں، میں اس وقت صرف دفتر اور گھر کے فاصلے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اکثر اوقات تو یہ فاصلہ اتنا لمبا اور کٹھن ہوتا ہے کہ ساری عمر گنوا کر بھی آدمی دفتر تک نہیں پہنچ پاتا...... کیوں بھائی شیرے، کیسے ہو؟ کالج چھوڑنے کے بعد یہ سارے سال کہاں رہے، کیا کام کرتے ہو؟...... کام ڈھونڈنے کا کام!...... پر شیرے، میں تو اپنے دفتر میں بھی یہی کرتا ہوں، کام کے انتظار میں بیکار بیٹھا رہتا ہوں اور ڈرتا رہتا ہوں کہ کام سالا اچانک وارد ہو کر سر پر نہ آ بیٹھے...... میں نے شری کانت کے بارے میں پڑھ رکھا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں سولہ گھنٹے کام کرتا ہے...... کیا کام؟ ایکٹنگ؟ چھوڑیئے میں چوبیس گھنٹوں میں چوبیس گھنٹے ایکٹنگ کرتا ہوں۔ آدمی پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ ساری زندگی اداکاری کرتا رہے اور اپنا یہی ایک کام پورا کر کے چلتا بنے...... مجھے پچھلی سیٹ سے روبی کی آواز سنائی دی ہے...... بھوک لگنے پر روٹی کھاتے ہوئے بھی اداکاری کرتے ہو؟...... روبی جانتی ہے میں سارا دن کچی مونگ پھلی کھاتا رہتا ہوں۔ مجھے بھوک لگنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ پر اسے کیا جواب دیتا...... جاؤ پٹرول پیو۔

روبی بہت پٹرول پینے لگی ہے۔ بوڑھا ہو کر آدم بھی تو انگلیاں چاٹ چاٹ کر کھاتا ہے۔ جب میں نے اسے خریدا تھا تو اس کی کاٹھی پکی تھی، اسی لئے تو اس پر چڑھے ہوا میں اڑا پھرتا...... ہاں، میں نے روبی کو ہی اپنی دلہن بنائے رکھا...... نہیں، میں نے شادی نہیں کی۔ میرے کوئی نہیں۔ بیوی بچے، نہ ماں باپ، نہ بھائی بہن۔ میں اکیلا آپ ہی آپ ہوں، یا پھر ایک یہی اپنی روبی، جس نے پہلے صحت مند بیوی کی طرح مجھے سنبھال رکھا تھا اور اب بیمار ماں کی طرح میری دیکھ بھال کرتی ہے۔ جب نئی نئی تھی تو خالی گاڑی دروازے پر ہوتی تھی

اور روبی میرے ساتھ اندر سوتی تھی...... اب؟ اب تو بوڑھیا سارے دن کی تھکی ہاری دم سادھے رات بھر دروازے پر پڑی رہتی ہے۔

شری کانت؟...... ہاں شری کانت اب پانچ دس منٹ میں ہی آنے والا ہے...... میں نے روبی کی رفتار پھر بڑھالی ہے...... میرا جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر ہمیشہ باتیں کرتا رہوں، مگر وہ تو ہفتے میں صرف ایک بار آتا ہے اور صرف اپنی سناتا ہے، میری نہیں سنتا۔ پھر بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے سب کچھ ہوتے ہواتے اس کے بھی کوئی اپنا نہیں۔ میرے ایک روبی تو ہے۔ وہ تو اپنی گاڑیاں اور عورتیں اتنی تیزی سے بدلتا رہتا ہے کہ اسے کسی کا نام بھی یاد نہ ہوگا۔ جس عورت کے ساتھ آج کل رہ رہا ہے؟...... اس کے بارے میں بھی وہ اپنے آپ کو سمجھاتا ہوگا، تمہیں نام سے کیا لینا ہے، اپنا کام کرو......

اچھے لونگ کے لئے اپنی گاڑیاں بدلتے رہیے...... مجھے اپنا ذہن بھی ٹی وی اسکرین ہی معلوم ہوتا ہے۔ ذہن پر یکلخت یہ کمرشیل آگیا ہے اور میری اسٹوری منقطع ہو گئی ہے۔ میں نے ٹائم دیکھنے کے لئے رسٹ واچ پر نظر جمائی ہے۔ سات بج کر پچیس منٹ۔ بے خیالی میں میں اپنی کالونی کے گیٹ میں داخل ہو چکا ہوں مگر مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ابھی تک اپنے پیچھے ہی کہیں بھٹک رہا ہوں۔

اپنے آپ کو گھر سے چند گز کے فاصلے پر پا کر مسرت سے میری گھگی بندھ گئی ہے۔ میں نے ایک دم پورا تھراٹل دبا کر روبی کا منہ اتنے پٹرول سے بھر دیا ہے کہ اسے اچھو ہو گیا ہے اور میرے لگژری فلیٹ کے سامنے اچھلتے ہوئے آخری ہچکی لے کر وہ ٹھنڈی ہو گئی ہے، اور اسے وہیں چھوڑ کر میں نے سرعت سے فلیٹ کا دروازہ کھولا ہے اور اندر داخل ہو کر اسے کھٹاک سے بند کر دیا ہے اور ڈگ ڈگ بیڈ روم میں آکے، ٹی وی آن کر کے وہسکی کی بوتل اور کچی مونگ پھلی کا ڈبہ کھولا ہے، اور اس سے پہلے کہ کچن سے پانی کا جگ لا کر صوفے پر جم جاؤں، شری کانت ٹی وی کے ڈبے میں برآمد ہو گیا ہے۔

شری کانت کی آمد پر پہلا پیگ میں ہمیشہ ایک ہی ڈیک میں پی جاتا ہوں اور دوسرا اور تیسرا ٹی وی کے ڈبے میں بند ہو کر دھیرے دھیرے، کچی مونگ پھلی کا دودھ چوستے ہوئے۔ جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، شراب کا نشہ تو مجھے شراب پینے کی توقع پر ہی ہوتا ہے، سو ٹی وی کے ڈبے کے اندر پورے ہوش و حواس میں میری روح شری کانت کے قالب میں اتر گئی

ہے اور آج پھر میں ایک نئی عورت کو پہلو میں دبائے ہوئے ہوں اور صوفے پر ڈھیر جسم سے میرے ہاتھ اسے بے جامہ کرنے کے لئے اسکرین کی طرف بڑھ آئے ہیں اور آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی ہیں اور......

اچانک ایک کمرشل بریک:

شدھ ڈی ٹرجنٹ ٹکیا

شدھ لگایئے داغ مٹایئے

اور پھر ایکاایکی بجلی فیل ہو گئی ہے۔

میری لاش کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہے۔

کوئی روشنی!

نازائیدہ

رانا پلیس کے بار میں چند دوست بیٹھے شراب پی رہے تھے اور متعجب تھے کہ دو بڑے بڑے ٹاٹ حلق سے اتار لینے کے باوجود نشے کا احساس کیوں نہیں ہو رہا ہے۔

"ایک تو یہ ہو سکتا ہے" سمپت کہنے لگا "کہ سالی شراب ہی اچھی نہ ہو۔"

"مگر شراب کی بوتل پر مہر وغیرہ تو میں نے چیک کر لی تھی۔" رام سنگھ نے اسے بتایا۔

"مہر کو چھوڑو یار" جمال نے کہا۔ نوکری اور بیوی ملنے سے پہلے مہر تو میری بھی بڑی سختی سے چیک کی گئی، مگر مجھے معلوم ہے کہ میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔"

"تو دوستو، نتیجہ یہ نکلا کہ شراب تو اچھی ہے، شاید ہم ہی برے ہیں۔"

"شاید کیوں؟ مجھے تو یقین ہے کہ میں ہی برا ہوں۔"

رام سنگھ سب کے لیے ایک ایک اور تگڑا سا ٹاٹ بنانے لگا۔

"نہیں، اگر تم واقعی برے ہو مہربان سنگھ، تو اب تک تم پر شراب کا بڑا اچھا نشہ طاری ہو جانا چاہیے تھا...... میرے گلاس میں تھوڑی اور ڈال دو رام سنگھ۔" سمپت نے اپنا گلاس رام سنگھ کی طرف سرکا کر کہا۔ "میرا تو یہ خیال ہے کہ ہم اچھے ہیں نہ برے، بس جیسے ہیں ویسے ہی ہیں، ورنہ نشہ نہیں چڑھا تو ہم کم سے کم ہوش میں تو ہوتے۔"

"میں تو پورے ہوش میں ہوں۔" رام سنگھ سمپت کے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔

"پورے ہوش میں؟...... ہہ ہہ ہا...... ہہ!...... ہہ!......"

مہربان سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ "واہ بھائی جی، واہ!...... تم ہی ایک خوش نصیب ہو رام سنگھ جسے آج نشہ چڑھا ہے۔"

"ہاں بھئی، آج کل تو ہمارا خدا بھی پورے ہوش میں نہیں۔ جو شخص بھی دنیا میں بھیج رہا ہے، ہم جیسا...... چند لوگ اچھے ہوں چند برے، کوئی گھمسان کا یدھ ہو اور جینے دینے کا

ذرا مزہ آئے......"

"ہاں۔" رام سنگھ انہیں سمجھانے لگا۔ "اسی لیے میں اپنے آپ سے چوبیس گھنٹے لڑتا رہتا ہوں، اپنی اتنی پٹائی کرتا ہوں پر مجال ہے ایک خراش بھی آجائے۔"

"نہ بابا، مجھے تو مار کٹائی سے ڈر لگتا ہے۔ میرا خون اتنا میٹھا ہے کہ ذرا بھی زخم آجائے تو بھرنے کا نام نہ لے۔"

تم ٹھیک کہتے ہو مہربانے، ہم لوگوں کی سوچ کو بھی ذیابطیس ہو گیا ہے۔ تھوڑا سا غصہ آبھی جاتا ہے تو ہم زخم کے ڈر سے ہنسنے لگتے ہیں۔یار، کوئی مزیدار جوک سناؤ، رام سنگھ۔"

"وہ تو اپنا جوک سنا چکا ہے کہ پورے ہوش میں ہے۔"

"سمپت میرے بھائی۔" مہربان نے کہا۔ "میری آنکھوں میں سگریٹ کا دھواں کیوں چھوڑ رہے ہو؟......"

"تاکہ چبھن سے تمہاری آنکھوں سے گندہ پانی اتر جائے مہربانے، اور تم صاف صاف دیکھنے لگو۔"

"صاف صاف دیکھنے سے بھی کون سا واہگورو نظر آجائے گا یارو۔" مہربان سنگھ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ "لاؤ رام سنگھ، تھوڑی اور ڈالو۔اپنے سردار بھائی ہو پر ہر بار دوسروں سے کم ڈال جاتے ہو۔"

"ہاں سردار بھائی۔ میں بڑا کمینہ آدمی ہوں۔ کسی سالے کو اپنا سمجھ کر فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں تو بے چارے کو مجھ سے الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔"

"لو مہربان۔" سمپت نے سگریٹ سلگا کر پیش کش کی۔ "اس سے پہلے کہ میں اپنا خیال بدل لوں، میری حماقت کا فائدہ اٹھاؤ اور اس راؤنڈ کا میرا یہ بقیہ حصہ بھی پی جاؤ۔ جلدی کرو بھائی!......"

"کوئی نیکی کرنے کا خیال آتے ہی ہم اپنے آپ کو احمق کیوں سمجھنے لگتے ہیں؟" جمال نے منہ اتنا معصوم بنالیا کہ سمپت کا جی چاہا، اسے ڈانٹ دے، چپ! بڑوں کی باتوں میں بچے نہیں بولتے۔

"بتاؤنا، کوئی نیکی کرنے کا......"

"ارے بتائیں کیا؟" سمپت نے اسے ٹوکا۔ "نیکیاں کرنا صرف نیک آدمیوں کا کام

ہے۔ ہمیں اوپر والا کوئی اسپیشل الاؤنس تھوڑا ہی دیتا ہے جو اپنا کام بڑھاتے چلے جائیں۔"

"اس میں بے چارے اوپر والے کا کیا دوش؟ وہ تو اوپر کے چند لوگ ہی اس کی ساری نعمتوں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔" جمال کو سر کھجانے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن اپنی ٹوپی اتار کر اسے سر کھجانا یاد نہ رہا۔ "اور باقیوں کو جیتے جی جہنم میں ہانک دیتے ہیں۔"

"میرا واہگورو تو میری سنے گا نہیں، جمال۔" مہربان سنگھ نے کہا۔ "پر تم اتنے برے نہیں ہو۔ کبھی فرصت میں اپنے خدا کو ساری باتیں کھول کر سمجھا آؤ۔"

سمپت ہنسنے لگا۔ "سالی شراب ہی جب بے اثر ہے تو خدا سے باتیں کرنا کیونکر ہوگا؟۔ ......بوائے، اور بھجیا لاؤ!......"

"بھجیا سے ہی پیٹ بھر لو گے سمپت، تو شراب کہاں ڈالو گے؟"

"سر میں، رام سنگھ! میں پیتا ہوں، تو صرف اس لیے، کہ اپنا سر شراب میں ڈبو دوں اور میری ساری سوچیں مردہ ہو کر سطح پر ابھر آئیں......"

جمال کو اچانک سر کھجانا یاد آگیا اور وہ ٹوپی پہلو میں ڈال کر سر کھجانے لگا۔ مگر اب کے اسے وہ بات بھول گئی جسے کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا تھا۔

"میں بھی جب خوب پی لیتا ہوں دوستو۔" مہربان سنگھ انہیں بتانے لگا۔ "تو میری سوچوں کے لاشے ابھر ابھر کر اندرونی کھوپڑی کو چھونے لگتے ہیں اور میں بے چین ہو کر اپنے سر کو اور زور سے کھجانے لگتا ہوں، اور میری مردہ سوچیں جوؤں کی جون میں جھڑنے لگتی ہیں۔......"

"تمہیں زندہ یا مردہ سوچوں سے کیا غرض، مہربان سنگھ؟" جمال کو سر کھجا کر چین آگیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہاری جوئیں ہی جوؤں کی جون لے کر جھڑتی ہوں گی۔"

گرم گرم بھجیا آگیا تو چاروں نے بیک وقت پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔

"شراب کے ساتھ ہمیں اچھی خوراک کھانی چاہیے۔" رام سنگھ نے منہ کو بھجیا سے بھر لیا۔

"بھجیا میں رکھا ہی کیا ہے؟"

"ہاں بھجیا میں کباب کہاں سے آجائیں گے؟...... بوائے! کباب کی بھی ایک پلیٹ

لے آؤ!''

''پر تم تو گوشت خور نہیں ہو، سمپت؟''

''جب سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ گھاس پھوس میں بھی جان ہوتی ہے میں نے ہر جاندار کا گوشت کھانا شروع کر دیا ہے۔''

''انسان کا بھی، سمپت؟''

''انسان کا بھی کھا لیتا لیکن مجھے گوشت کی جگہ پلاسٹک کھانا پسند نہیں...... ارے سنو، باہر مارکیٹ میں شور کیوں ہو رہا ہے؟......''

سینکڑوں قہقہے باہر سے سرپٹ دوڑتے ہوئے ان کے کانوں میں آگھسے اور ناک یا منہ یا آنکھوں میں تیز تیز پھدکنے لگے۔

''آؤ، باہر جا کے دیکھتے ہیں۔''

چاروں باہر آگئے اور دیکھا کہ انگنت لوگ مارکیٹ کے فرسٹ فلور کے جنگلے پر جھکے بے تحاشہ ہنستے ہوئے گراؤنڈ فلور کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

سمپت سب کے آگے آگے جنگلے کی طرف ہولیا۔ وہ اس قدر احتیاط سے چل رہا تھا کہ صاف پیے ہوئے معلوم ہوتا تھا...... ارے!...... اچانک وہ کسی سے ٹکرا گیا اور اس بھلے مانس کو ہدایت کرنے لگا کہ شراب پی کر گاڑی چلانا منع ہے۔ وہ ہنسنے لگا تو یہ بولا، ارے بھائی، گاڑی ہی تو چلاتے ہو۔ نشے میں ٹوٹ پھوٹ گئے تو ساری عمر پھک پھک کرتے بیتے گی۔ ارے بھائی رام سنگھ۔'' اس نے اچانک اپنا منہ رام سنگھ کی طرف موڑ لیا ''وہسکی کی بوتل وہاں میز پر ویسے ہی چھوڑ آئے ہو، کوئی بیرا ویر امنہ لگا کے اتنی ہی پانی سے بھر دے گا۔''

''ہاں۔'' مہربان بولا۔ ''میں کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کے ساتھ ہی لے آیا ہوں۔'' جنگلے کے آس پاس بھیڑ کو چیر کر وہ بھی نیچے دیکھنے لگا۔

''کہاں ہے؟''

''کیا؟ کون؟......''

''وہ...... وہ دیکھو!......''

انہوں نے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

ایک نوجوان عورت اپنے گھاگرے کو ہاتھوں سے اوپر اٹھا کے ایک دکان کے سامنے

ننگی کھڑی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر بھی کئی آدمی اس کے ارد گرد جمع ہو کر چلا رہے تھے۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھی، اعصاب تنے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کو جھٹک جھٹک کر گویا بڑے دھیان سے دیکھنے کو کہہ رہے تھے۔

''او بھوری......!''

''اری بھوری، ادھر بھی تو دیکھو!......''

''لو دیکھ لو!'' بھوری بولنے والوں کی طرف ناچنے کے انداز میں مڑ مڑ کر ویسے ہی ننگی کی ننگی کھڑی ہو جاتی ''لاؤ، کیا دو گے؟''

''ادھر بھی، بھوری!'' کسی نے اُس کی طرف دو کا نوٹ پھینک کر خواہش ظاہر کی۔

اور بھوری نے ہنستے ناچتے نوٹ اُٹھا کر اس کی طرف منہ کر لیا۔ ''لو!''

اُس کے سامنے کی دکان والے نے اُس سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''جاؤ، بھوری، بھگوان کے لئے جان چھوڑ دو۔''

بھوری نے اپنا گھاگرا کندھوں تک اوپر اٹھا کے گلے میں لپیٹ لیا اور دکاندار کی طرف سر اٹھا کر مسکرائی۔ ''پہلے پانچ روپے دو، پھر چھوڑوں گی۔''

''پولیس!......پو......!......''

بھوری نے دھڑاپ سے گھاگرا نیچے گرا لیا اور مڑ کو دیکھنے لگی، مگر یہ اطمینان کر کے کہ کسی نے یونہی مذاق کیا ہے، گھاگرے کو پھر اوپر اٹھا لیا اور لوگوں نے پھر اپنی نظریں اُس کی رانوں میں ٹھونس لیں۔

دکاندار نے بڑبڑاتے ہوئے روپے روپے کی دو تین سکے اس کی طرف پھینکتے ہوئے کیا۔ ''جاؤ موری ماں، بھاگو اب......!''

''ڈٹی رہو، بھوری، ڈرو نہیں......لو!......''

''لاؤ'' بھوری نے بولنے والے کی طرف مڑ کر کہا۔

لو!......لو!............ل......!......

یکبارگی کئی تماشائی اُس پر چاروں طرف سے چھوٹے موٹے سکے پھینکنے لگے۔

''ارے!......ارے! میری جان کے بیری کیوں ہو گئے ہو؟'' بھوری اپنے وجود کو گھما کر بولی۔ ''کنکر کیوں مار رہے ہو؟ نوٹوں اور نجروں سے مارو......''

"سمپت!...... سم......" سمپت جنگلے پر جھکے نیچے لڑھک جانے کو تھا کہ جمال نے اُسے تھام لیا۔ "اُس بھوری بھینس کے پاس پہنچنا ہے تو ادھر سیڑھیوں سے نیچے جاؤ۔ یہ راستہ تو سیدھا جہنم کو جاتا ہے۔"

"تو کیا ہوا، میرے یار؟ تم بھی تو میرے ساتھ ہو گے......"

رام سنگھے، تمہاری پتلون کوئی گھاگرا تو نہیں جو تم بھی اُسے بار بار اوپر اُٹھا رہے ہو۔"

"نہیں مہربان، بات یہ ہے کہ وہ اپنا گھاگرا اوپر اُٹھاتی ہے تو مجھے لگتا ہے میری پتلون نیچے سرک رہی ہے۔"

"سرکنے دو، سنگھے،...... پر کیا فائدہ؟ پتلون کے نیچے تم نے اپنا کچھا صاحب پہن رکھا ہو گا۔"

اِسی اثنا میں اوپری منزل سے دو تین دکاندار بھوری کو وہاں سے ہٹانے کے لئے اس پر پانی کی بالٹیاں انڈیلنے لگے اور وہ سرعت سے گھاگرے کو ٹانگوں پر گرا کے چیختی ہوئی مارکیٹ کے باہری گیٹ کی طرف بھاگنے لگی اور اس کے پیچھے ساری بھیڑ۔

"بھوری تو گئی لیکن چلو، ہماری بھوری بوتل تو موجود ہے۔"

تمہاری بھوری کس کام کی ہے رام سنگھ؟...... دیکھو نا، جو بھوری نشہ آور تھی، اس کا کاک آپ ہی آپ بھپ سے کھل گیا،...... وہ آپ ہی آپ منہ سے آ لگی اور اس سے پہلے کہ لوگ اسے غٹ غٹ پی جائیں، وہ آپ ہی آپ پھر سے اُڑ گئی...... "سمپت اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ "بڑی خاص چیز تھی۔"

"وہ تو گئی بابا، پر یہ جو ہے۔ جیسی بھی ہے، اِسے کیوں چھوڑتے ہو؟...... آؤ۔"

"چلو!" سمپت چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ "سالی اتنی آبدار شئے تھی کہ اُس کے جانے کے بعد بھی لگ رہا ہے اُسے گھونٹ گھونٹ پیے جا رہے ہیں۔" اُس نے پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"جو چیز ہاتھ سے نکل جائے سمپت۔" جمال اُسے سمجھانے لگا۔ "اُسے بھول جانے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔"

"کیا اُسے بھول کر آپ اپنا بھلا کر چکے ہیں، مولوی صاحب؟"

"نہیں، مجھے تمہارا بھلا کرنا مقصود ہے۔ میرا تو یہ ہے کہ جو بھی بری خواہش میرے

بس سے باہر ہوتی ہے اُسے پورا کرنے کے لئے کوئی ایسی بری خواہش پوری کر لیتا ہوں جو میرے بس میں ہو۔"

"تو جاؤ، اس پیشاب گاہ میں اپنی خواہش پوری کر آؤ...... آؤ سمپت۔"

"نہیں ٹھہرو" سمپت نے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا۔ "ابھی ابھی میلا لگا ہوا تھا مگر اتنی سی دیر میں ہی اب، کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"دکھائی کیسے دے؟ وہ سبھوں کو اپنے گھاگرے میں سمیٹ کر لے گئی ہے۔"

"ہہ ہہ...... ہہ......!" سمپت اپنے شرابی قہقہے سے گدگدی محسوس کر کے اور زور سے قہقہانے لگا۔ "ہہ ہہ ہا!...... سبھی حرامی پلے بڑی امید سے ماں کے گھاگرے میں جا سمٹے ہیں کہ شاید اس طرح پیدا ہو جائیں گے، پر اُن سے پوچھو وہ بانجھ انہیں جنے گی کیسے؟...... ہہ...... ہا!......"

انکار

لاؤبی بی جی، اب داہنی ٹانگ اِدھر بڑھادو...... ابھی اُدھر ہی دابے جاؤں؟...... اچھابی بی جی...... آپ اِتی ورجس کرکر کے بدن کا ہے کو توڑے ہو؟ ورجس کوئی کام تھوڑی ہے کے کرے بنا نبے ناہیں۔

ہاں، میں ہر روج اسی وخت آجایا کروں گی...... تنکھا؟...... آپ پڑوس والی بی بی جی سے پوچھ لو۔ وہ بیس اُپّر سو روپلی مہینہ دئے ہے...... ہاں، بی بی جی، ٹھنڈے کو چھٹی۔ ٹھنڈے کو میں سر پھ اپنے مَرد کے پاؤں دابتی ہوں۔ وہ تو آپ کی تراں ورجس بھی ناہیں کرے پھر بھی جب دیکھو، جنور بن کے ہانپتے رہے ہے۔

مورا آگا پیچھا کا پوچھے ہو، بی بی جی، کتے بلیوں کا بھی کوئی آگا پیچھا ہوئے ہے؟ جدھر بھی کوئی روٹی کا ٹکڑا دکھا کے پچکارے ہے، دم ہلا ہلا کے اسی کو مائی باپ سمجھ لیوے ہیں...... ناں، بی بی جی، موجھے ناں اپنی ماں کا اتہ پتہ ہووے ہے، ناں باپ کا۔ کوئی ناں کوئی ہویں گے توجرور، یہ موجھے مالوم ناہیں، کون موجھے کس کے پیٹ میں لاد کے لے آئے تھا...... سچی، مالوم ناہیں، ناہیں تو بول ناں دیتی؟ موجھے تو بس ایک چاچی کا مالوم ہے۔ وہ موری لگے تو کچھ ناں تھی، پر میں اس کو چاچی ہی بولا کرے تھی۔ کا پتہ، کدھر سے چرالائے تھی، جاں کھریدلائے تھی...... کاہے کو؟...... اور کاہے کو؟ سوچے ہوگی، بڈھاپے میں کام آوے گی...... ناہیں بی بی جی، ہمار لوگوں میں لڑکا ایک کوڑی کا ہوئے ہے تو لڑکی دو کی۔ ناہیں، لڑکی کے مکالبے میں لڑکا کس کام کا؟ مونچھیں پھوٹتے ہی لٹھ پکڑ کر مائی باپ کو آگے لگا لئے ہے۔ بڈھوں کھڈوں کا اب جو ہوئے سو ہوتا رہے...... لڑکی؟...... لڑکی تو گنا ہووے ہے بی بی جی، جوں جوں اونچی نکلے ہے، اس میں رس ہی رس بھرتا چلا جائے ہے۔ اسے لڑکی کاہے کو بولو، پیسہ بنانے کی مسین بولو...... کا؟...... میں باتیں بوہت کرے ہوں؟...... ہاں بی بی جی، پڑوس

والی بی بی جی بھی بولے ہے، بات کم کیا کرو بھاگ بھری...... ہاں، آپ کو اپنا نام بتانا تو بھولے گئی۔ مورا نام بھاگ بھری ہے...... ہاں، بی بی جی، نام بڑے اور درسن چھوٹے...... میں تو سوکھے بھاگوں بھی پرماتماں کا سکر کرے ہوں، وہ اتنے میں بھی نہ رکھے تو اس کا کا بگاڑ سکے ہوں؟...... لاؤ، اب داہنی ٹانگ موری ترپھ بڑھائے دو۔

آگے کی کا سناؤں، بی بی جی؟ مورا کوئی گھر بار تو ناہیں تھا، پہ موری جڑیں جمین میں کھوب مجبوتی سے جڑے تھیں، سو گنے میں آپ ہی آپ رس بھرے گیا، اتا بھرے گیا کہ چاچی کوئی مردورد ہوتی تو کھد آپ ہی مجھ سے بیاہ رچائے لیتی۔ بڈھی کھڈی اورت جات تو کچھ مانگے ہے تو باکی کے دو دن کا سکھ آرام، سو اس نے میرے پہلے کھاوند سے پیسہ لئی لیا اور موجھے رکست کیا۔ اس تراں میں اپنے پہلے کھاوند کے باد دوجے کے پاس آئے گی اور دوجے نے بیچ دیا تو تیجے کے پاس۔ آج کا مردوا رام بن باس مورا چوتھا کھاوند ہے...... ہاں، رام بن باس اجیب سا نام ہووے۔ اس کا باپ مشٹنڈا کوئی شادھو شنیاسی ہووے گا۔ مورے دوسرے کھاوند کا نام بھی موجھے بڑا اجیب لگے تھا...... سری کسن...... ہاں...... ناں، نام تو سایدا اتا اجیب ناہیں، یہ موجھے اس لئے اجیب لگے تھا کہ سکل اور کرنی سے وہ نرا پراکنس تھا...... آدم کھور تھا بی جی، پیار کرتے وقت دانتوں سے بدن کے کتلے بنا کے رکھ دیوے تھا۔ اس نے جب مورے تیجے کھاوند کا بیچ دیا تو میں نے شکر کیا کے آجاد ہوئے گی۔

اب جو کھاوند ہے؟...... وہ موجھ سے ہووے تو بہت کمزور، پھر بھی ہات اٹھانے سے باج ناہیں آئے ہے۔ پہلے پہل تو اس کی مار میں چپ چاپ سہے لے تھی، پر اب میں بھی پورا جور لگائے کے ایسی جڑ دیئے ہوں کے اس کی چیکھ نکل جائے ہے...... ہاں، بی بی جی اور کا؟...... اس کے باد موجھے کھد آپ ہی اس کی چوٹ سینکنی پڑ جائے ہے۔ اسی لئے تو آج سارے گھروں میں دیری سے پہنچے ہوں...... ہاں، آپ کے پاس بھی۔ وہ وخت ناں وخت کھا نکھا کوئی مردہ جھگڑا کھڑا کردے ہے۔ پہلے تو میں اپنے دھرم کا پالن کئے کھاترچپی سادھ کے اس کی مار کھائے گئی، پھر کا ہوئے گیا کے میں نے گسّے میں آئے کے اپنا بندھا ہوا ہات کھولے لیا...... ہائے بی بی جی، بے چارے کی ناک پھول کر کیا ہوئے گئی۔ پورا آدھا گھنٹہ میں گرم اینٹ سے اس کی ناک سنکے رہی، پھر وہ بولا، جاؤ اب اپنا کام کرے آؤ...... موری چوٹیں؟...... موری چوٹوں کا، بی بی جی، کا؟ آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائے ہیں۔ وہ سسرا موری چوٹیں کا ہے

کو سکے؟...... اب الٹی ہوئے جاؤ، بی بی جی۔ پیٹھ بھی دبائے دؤں۔

ہاں، میں چار گھروں میں کام کرے ہوں، آج ایک آپ کا بھی ہوئے گیا، سو کل ملائے کے پانچ گھر۔ سویرے چھے بجے سوئے کے اٹھ پڑے ہوں۔ انگ انگ پیڑا سے سیٹیاں بجار ہا ہوئے ہے...... نائیں ڈاکدار کا کرے گا؟...... کھاٹ سے اٹھے ہوں تو سیٹیاں کھد بکھد بند ہو جائے ہیں۔ کام والے کی ہر پیڑا کا دوادارو بس جے ہی رہے کہ وہ کام بند نہ کرے، ہاتھ پیر ہلائے رہے۔ کھاوند مورا موری آنکھ کھلنے سے پہلے ہی بیڑی پی پی کے کھانس رہا ہوئے ہے۔ سب سے پہلے میں چائے کے لئے چولہا سلگائے ہوں اور اپنے رام بن باس کو ایک کوپ چائے پلائے کے دون کھد آپ پیے ہوں...... دون اس لئے بی بی جی، کے ناہیں تو پچھلے دن کا کھایا پیا پیٹ میں ہلے ہی نا ہیں، پھر میں نہائے دھوئے کے اس کا سارے دن کا کھانا پکانے میں جٹ جائے ہوں۔

ناہیں، بی بی جی، وہ نکھٹو کام کاہے کو کرے ہے؟ سربھ جات کا بڑھئی ہے۔ جات پات اور اجت بنی رہے تو اسے اور کچھ ناہیں چاہیے۔ ہپھتے میں بس دو تین بار آدھے دن کے کام پر کہیں چلا جائے ہے اور باکی سارا وخت جھگی میں بیٹھے اپنی بیڑی کے دھوئیں میں کھاٹ کے کھیالی پائے بناتا رہے ہے۔ کا بولوں، بی بی جی، بڑا بے کار مرد ہے!

ہاں، بی بی جی، جیسا بھی ہے آکھر اپنا ہی مرد ہووے ہے۔ اُپر والا جے بھی ناں دیتا تو میں اس کا کا بگاڑ سکے تھی، سو اچھا ہی لاگے ہے اور اچھا ناں بھی لاگے تو کروں کا؟ اپنا داس ہی نرک میں ہے، ادھر کوئی سام شندر کسن کنہیا تھوڑی آئے ہے...... جیادہ جور ناں لگاؤں؟...... ایسے؟...... ٹھیک ہے بی بی جی۔

ہاں، بی بی جی میں کوئی ساڑھے آٹھ نو بجے گھر سے نکل پڑے ہوں، ایک کے باد ایک ساسوں اور بہوؤں کے بالوں میں تیل ڈالے ہوں، مالش کرے ہوں، مہندی لگائے ہوں اور پیر اور پنڈا دابے ہوں...... ہاں بی بی جی، اس گھر میں بھی کام کیا کرے تھی۔ ساس اور بہو کا ہمیساں جھگڑا ہوا کرے تھا...... ہاں بہو کی اپنے مرد سے بھی نہ بنے تھی، پہ وہ مورے کام سے بوہت کھس تھی اور بولا کرے تھی، بھاگ بھریے، تمہارا ہاتھ لاگے پر بدن کبوتر کی طرح پھر سے اڑ جائے ہے، پر کا پھائدہ؟ اڑ اڑ کے پھر موا اسی چھت پر آن گرے ہے...... ہاں، بی بی جی اورت کدھر بھی نکل جائے اپنے گھر کے سوا کدھر جائے گی؟...... ہاں جے ہی تو کہے

ہوں، رات کی سیاہی منڈلانے لگے ہے تو میں بھی کھد بکھد اپنے رام بن باس کی جھگی کی ترپھ ہوئے لئے ہوں...... میرا دن بھر کا کھانا پینا؟...... مورا کھانا پینا بس اتا ہی ہوئے ہے جتنا کام کے گھروں سے مل جائے...... ہاں، بی بی جی کھائے کھائے کوئی چیج مجے دار لگے ہے تو اپنے ہسے سے اپنے رام بن باس کے لئے بھی باندھ لئے ہوں...... اپنا جے باجو بھی اب موری ترپھ کرے دو...... اچھا لگ رہے ناں؟ مورے ہاتھ کی داب سے کھس ہوئے کے لوگ انوکھی باتیں کہے ہیں۔ ایک سو دس لمبر والی بی بی جی بولے ہے، تمہارے ہاتھوں کے منہ ہووے جو کایا کا سارا درد چوس لئی ہیں، پھر مانو کایا ہووے ہی ناں...... ہہ ہاہہ !...... وہ کا کہے ہیں بی بی جی، ناں ہووے بانس، ناں باجے بانسریا، کایا ہی ناں ہووے تو درد کاس کا؟...... ناہیں بی بی جی میں تو رات کو واپس اپنی جھگی میں پہنچے ہوں تو تکھن اور ٹوٹن سے جان نکلے جائے ہے، جان ساید نکل ہی چکے ہے، ناہیں تو کایا الگ کیوں پڑی ہے اور جان الگ کیوں؟...... میں؟...... بی بی جی، میں تو اس میں بھی پھڑ پھڑائے جائے ہوں اور اس میں بھی...... ناہیں، بی بی جی، کھاٹ پر کیسے جا پڑوں؟ میرے سب سے مسکل کام کی باری تو اب آئے ہے...... کونسا کام؟ آپ سے کا سرم؟ اپنے مرد کے ساتھ سونے کا کام...... میں تو چاہے ہوں، منہ سر لپیٹ کے جھٹ سے اپنے ساتھ سوئے جاؤں، پہ اپنے کھاوند کے ساتھ سونے کا کام بھی جی لگا کے پورا ناں کروں تو مورا جے مالک بھی جوتے مار مار کے اپنی جھگی سے نکالے دے۔ آپ تو موجھے مورے کام کی تنکھا دیوے ہیں اور جے مورا مرد موجھ سے اپنا پورا کام کروا کے بولے ہے، لاؤ اپنی ساری تنکھا مورے حوالے کر دو۔

مورے بچے؟...... بتائے ہوں، پہلے اپنا دوجا باجو ادھر کرے دو...... ہاں، جوں!...... جے باجو بوہت درد کرے ہے؟...... ابھی ٹھیک ہو جائے گا...... موری سمجھ میں ناہیں آتا آپ اتنی ور جس کا ہے کو کرے ہو...... ہاں بتائے ہوں...... مورے کوئی بچہ ناہیں...... ناہیں، بی بی جی، ایسا ناہیں میری کوکھ میں اپنے پچھلے کھاوندوں سے ایک ایک بچے کی سانس بھرن سرد ہوئے گئی تھی...... ہاں، بی بی جی، تینوں بچے پیدا بھی ہوئے گئے پہ مردہ...... ناہیں! جو اپنا بھی نہ ہووے، وہ تیرا میرا کیسے؟

ہاں، بی بی جی، میری سمجھ میں بھی ناں آئے تھا کے سارے کے سارے کیسے مرے گئے...... ناہیں، اب تو کھوب سمجھے گئی ہوں...... ابھی بتائے ہوں، کا؟...... آپ سے کا پردہ؟

اس وخت بھی میں دوسرے مہینے سے ہوں...... پتہ ہے، کا؟...... رات کو اپنے رام بن باس کے کام سے چھٹی پائے کے میں چپ چاپ اپنے کھاٹ پر آلیٹے ہوں اور رات کے اندھیرے اور سناٹے میں کا ہوئے کے موجھے اپنے پیٹ سے رونے کی آواج آنے لگے ہے، مانو مورا بچہ جد کر رہا ہوئے کے کچھ بھی ہو جائے وہ ہمار نرک میں جنم ناہیں لیوے گا...... کا؟ آپ کے سر میں تیل بھی ڈالے دوں؟

بجھتے سورج کا سمے

"چلو ڈاڈو، آج تمہیں لیڈر پارک لے چلتے ہیں۔"

"وہاں کیا ہے، انو؟"

"اوپن ائر تھیٹر۔ آج وہاں شیکسپیئر کی ٹریجڈی، اوتھیلو، کھیلی جارہی ہے۔"

انو کا دادا ہنسنے لگا۔ "ہاں بھائی، زندگی ہو یا ڈرامہ، تمہارے امریکی اسے ہنستے کھیلتے رو لیتے ہیں۔"

"او ڈاڈو، ڈونٹ بی فنی!" انو نے اپنے بال جھٹک کر اپنے دادا سے کہا، جو پچھلے چند ہفتوں سے اپنے بیٹے کے یہاں وزٹ پر امریکہ آیا ہوا تھا۔ "چلنا ہے تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پورے ساڑھے چھ بجے شروع ہو جائے گا۔"

"ساڑھے چھ کا اعلان ہے انو، تو کم سے کم سات تو بجائیں گے ہی۔"

"نہیں ڈاڈو۔ یہ تمہارا ہندوستان نہیں۔ خواہ ایک بھی آدمی نہ پہنچے، پورے ساڑھے چھ پر شروع ہو جائے گا۔"

"کیا وہ پاگل ہیں بیٹی؟ کوئی ہوگا ہی نہیں، تو شروع کس کے لئے کریں گے؟ اپنے لئے؟" دادا پھر ہنس پڑا۔ "مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔ امریکی آپ ہی سب کچھ کرتے ہیں اور آپ ہی اپنے سامنے بیٹھ کر اپنے کئے پر خوش ہوتے رہتے ہیں۔"

"ڈونٹ بی نائی، ڈاڈو۔ دس پندرہ منٹ میں تیار ہو کر نیچے گیراج میں آجاؤ۔"

"دادا کو کہاں لے جا رہی ہو انو؟" دادا کی بہو ایشا بھی آ گئی۔

"کسی کالے شوہر نے اپنی سفید بیوی کو قتل کر دیا ہے بہو، اور پھر اس کی بے گناہی کا یقین ہونے پر اپنی جان بھی لے لی ہے۔"

"کہاں، کیا یہیں ہمارے پڑوس میں؟ چلو، میں بھی چلتی ہوں۔"

"ڈاڈو، ممی کو بنا کیوں رہے ہو؟ ہم لیڈر پارک میں شیکسپیئر کا ڈرامہ دیکھنے جا رہے ہیں ممی۔"

"میں بھی چلوں گا۔" راہو بھی اسی اثنا میں اپنے سکول ٹیبل ٹینس کا میچ کھیل کر لوٹ آیا۔ "میں نے ابھی تک شیکسپیئر کا ایک بھی پلے نہیں دیکھا۔"

"دوسروں کے دیکھے ہیں؟" دادا نے پوچھا۔

"ہاں، ڈاڈو، مجھے وہ ڈرامے بہت اچھے لگتے ہیں جس میں تلوار کی لڑائی ہو۔" پھر وہ بتانے لگا۔ "میں نے تو تلوار چلانے کی کلاس بھی جوائن کر لی تھی مگر ڈیڈی نے روک دیا۔"

"ہاں، بیٹے، ہوا میں تلوار چلانا اچھا لگتا ہے۔"

"مگر تلوار تو صرف ہوا میں ہی چلائی جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔ ایک بات بتاؤں؟" دادا کو خیال آیا کہ اگر اس وقت اس کا بیٹا امیر یہاں موجود ہوتا تو اس کے اس تکیہ کلام پر اسے ضرور ٹوک دیتا۔ "سچ مچ کسی کی جان لینا ہو تو اپنی جان کا خطرہ کیوں مول لیا جائے، کیوں نہ دور پار سے ہی اس پر پستول چلا دیا جائے؟......"

"راہو کا دماغ پہلے ہی الٹی سیدھی باتوں سے بھرا پڑا ہے ڈاڈو۔"

"ہاں، پپا۔" ایشا نے اپنی بیٹی کو روک کر سسر کو مخاطب کیا۔ "اسے تم مہابھارت اور رامائن اور انڈین کلچر کا بتایا کرو۔"

"کیوں، ممی، میں اب کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔"

"نہیں۔" دادا نے منہ پکا کر کے اپنے پوتے کو یقین دلانا چاہا۔ "تم تو ہم سبھوں کے باپ ہو بیٹے۔ لیڈر پارک میں میرا ہاتھ مت چھوڑ دینا، ورنہ میں راستہ بھول جاؤں گا۔"

ان کے جانے کے بعد دادا تھوڑی دیر میں تیار ہو کر نیچے گیراج میں پہنچا تو انو اپنی ماں اور بھائی کو ساتھ لئے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دادا اپنے پوتے کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے بہو، تو امیر بھی کام سے لوٹ کر ہمارے ساتھ ہو لیتا۔"

"مجھے معلوم ہے پپا، امیر کو شیکسپیئر سے الرجی ہے۔" دادا کی بہو ذرا رک کر وضاحت کرنے لگی۔ "ایک دفعہ ہم کنگ لیئر کی فلم ورشن دیکھ کر آئے تو اس نے دو تین روز چھینک چھینک کر اپنی حالت غیر کر لی۔ کیوں انو، ٹھیک ہے نا؟"

"مگر صرف باتوں اور خیالوں سے الرجی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"جس بات کا علم نہ ہو۔" انو میڈیکل سائنس کے آخری سال کی طالبہ تھی۔ "اس میں ٹانگ مت اڑایا کرو ڈاڈو۔ الرجی اِز اے ویری اَیبس ٹریکٹ، ویری کامپلیکس فینا مینن!"

جتنی دیر میں دادا نے اپنی پوتی کی جانب فخر مندی سے دیکھا، اتنے میں ہی ان کی گاڑی باہر سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

"ذرا آہستہ، بیٹی!"

"تیز نہیں چلاؤں گی تو چالان ہو جائے گی۔"

"مگر ہمارے ہندوستان میں تو تیز چلانے پر چالان ہوتا ہے۔"

"تمہارا ہندوستان اسی لئے تو منزل پر صدی بھر لیٹ پہنچتا ہے۔"

"حفاظت سے پہنچ تو جاتا ہے۔"

"مگر کیا فائدہ، پپا؟" دادا کی بہو نے مداخلت کی۔ "ان کے پہنچنے پر منزل کوئی صدی بھر آگے پہنچ چکی ہوتی ہے۔"

"ایک بات بتاؤں؟" دادا سے رہا نہ گیا۔ "تم امریکی بھی تو اتنے میں منزل سے صدی بھر آگے جا پہنچتے ہو۔"

دادا اداس سا ہو کر سوچنے لگا، یہی تو مصیبت ہے۔ میرے پوتا پوتی کہیں اپنے آگے ہی آگے نہ معلوم کہاں پہنچے ہوتے ہیں مگر میں اپنی سست رفتاری میں اپنے پیچھے کہیں بھائیوں بہنوں کی گزرگاہوں میں رکا رہ جاتا ہوں اور ان سے باتیں کرتے کرتے وہاں سے بھی کوئی پون صدی پیچھے ننھا منا سا اپنے دادا کی گود میں جا بیٹھتا ہوں اور حالانکہ دادا جب میرا منہ چومنے کے لئے مجھ پر سر جھکا لیتے ہیں تو مجھے ان کی سفید مونچھوں کی چبھن سے وحشت ہونے لگتی ہے، پھر بھی ان کے بوسے کی شادماں حدت سے میں ان کی گود میں ایسے کودنے لگتا ہوں، جیسے کسی وسیع میدان میں، اور اس دوران مجھے آگا پیچھا یاد ہی نہیں رہتا۔ جو آپ ہی ابھی منا سا پوتا ہو، اسے کیا احساس کہ اسی دم پون صدی آگے اس کے پوتا پوتی اتنے بڑے، اتنے کارگر نکل آئے ہیں۔ یہی تو مصیبت ہے...... دادا نے اپنے آپ کو بتایا...... یکساں مقامیت نہ ہو تو ہمارے آگے ہی آگے ہمارے بچے نہ معلوم کہاں اوجھل ہوتے ہیں اور اس گمشدگی میں اتنے مانوس...... نہیں اتنے اجنبی معلوم ہوتے ہیں کہ خون میں ہی کہیں محسوس

ہوں تو ہوں...... ان اجنبیوں کو کلیجے سے لگا لینے کو جی ترس جاتا ہے مگر اس گھور بڑھاپے میں کوئی انہیں پیدا کیسے کرے، اُن سے اُنہی کے وجود میں کیسے مل پائے؟

اسی دوران گاڑی میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی...... دادا کی بہو نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا...... ہاں...... نہیں!...... کیوں؟...... ٹھیک ہے...... اگر ضروری ہے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟...... ٹیلیفون سے فارغ ہو کر اس نے سر دادا کی طرف موڑ لیا...... ''امیر آفس سے سیدھا واشنگٹن جا رہا ہے۔''

''کیوں، خیر تو ہے۔'' دادا نے گھبرا کر پوچھا۔

''سب خیر ہے، پپا۔ اس نے اپنا ایک سائنسی پراجیکٹ وہاں کاپی رائٹس بیچنے کے لئے دے رکھا ہے۔ آج آفٹر ڈنر بات چیت ہو گی اور کچھ طے ہو گیا تو امیر کل اور پرسوں وہیں رہے گا۔''

''مگر پرسوں تو میں واپس جا رہا ہوں۔'' مگر دادا اپنے الفاظ پر شرمندہ ہو کر سوچنے لگا۔ تو کیا ہوا؟ تمہیں واپس جانے سے کس نے روکا ہے؟ تمہارا تو اس دنیا سے ہی جانے کا وقت سر پر کھڑا ہے۔ کیا تمہارا بیٹا اپنے کام روک کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے تمہارے ساتھ بیٹھا رہے، کہ تمہاری چھٹی ہو تو اسے بھی چھٹی نصیب ہو؟...... ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

دادا کی بہو نے پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور پھر اسے دادا کی طرف بڑھا دیا۔

''امیر تم سے بھی بات کرنا چاہتا ہے پپا۔''

''ہیلو؟...... نہیں، امیر بیٹے، کوئی بات نہیں...... نہیں، جانے والوں کو رکنے پر اختیار نہیں ہوتا...... نہیں، میں فلسفہ نہیں بگھار رہا۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔ کیوں نہیں؟ اب دیکھو نا، میں بھی پرسوں جا رہا ہوں...... کیا میں خود کو روک سکتا ہوں؟...... تم آرام سے جاؤ بیٹے...... سکھی رہو!...... خوش رہو!......'' دادا کے منہ میں اور کئی دعائیں امنڈی چلی آ رہی تھیں مگر ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو جانے پر اسنے ریسیور اپنی بہو کی طرف بڑھا دیا۔

''ڈاڈو!'' انو کی نظریں سڑک پر بدستور آگے کا راستہ چیرتی ہوئی سرپٹ بھاگی جا رہی تھیں...... ''باقی کی دعائیں مجھے دے دو۔''

''ہاں، بیٹی، جتنی چاہو لے لو۔ میرے پاس دعاؤں کے سوا اور رہے ہی کیا؟''

''تمہیں معلوم نہیں پپا؟'' دادا کی بہو کہنے لگی...... ''امریکین قوم اسی لئے دولت مند

سے دولت، نیک سے نیکی، بد سے بدی اور......"

"تمہاری بات سمجھ میں آگئی ہے ممی......" راہو نے اپنی ماں کو ٹوکا۔ "کیوں اسے لمبا کیے جا رہی ہو؟"

"تمہاری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔" دادا کو اپنے پوتے کو ٹوکنے کی خواہش نے گدگدایا۔ "پہلے سمجھ لو۔ بات یہ ہے کہ امریکی ساری نیکی اور ساری بدی بٹور کر اپنے پیٹ میں اسٹور کر لیتے ہیں۔" دادا کو کوئی تیکھی سوچ آتی تو ہنسے بغیر نہ رہ سکتا...... "ایک بات بتاؤں؟ امریکی کسی آئندہ ورلڈ وار سے بچاؤ کی تدبیر کرتے ہوئے دراصل اپنے ہی پیٹ کی مہابھارت سے بے حال ہو رہے ہوتے ہیں......"

دادا کی بنگالی بہو کچھ یاد آنے پر ذرا سی اچھلی۔ "میرے ڈیڈی کہا کرتے تھے پپا، ہندوستانیوں کے پیٹ کی آگ اتنی بھڑک چکی ہے کہ انہیں وار فلنگ پر مقابلہ کرنا چاہئے۔"

"وہی تو ہم کر رہے ہیں بہو، مثلاً ہندوستانی والدین کا فوجی ڈسپلن دیکھو۔ محاذ پر ڈٹے رہنے کی خاطر وہ اپنے بچوں کو بھی عربوں کی اونٹ دوڑ کے لئے بیچ دینے سے دریغ نہیں کرتے...... ایک بات بتاؤں؟......" دادا نے اپنا لہجہ وشال کر لیا تھا تاکہ وہ انہیں بتائے کہ اس نے آج ہی اخبار میں کیا پڑھا ہے۔ "ایک یورپی خاتون نے ایک ہندوستانی باپ کو معقول رقم دے کر اس کے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی معاہدہ کر لیا کہ وہ اسے گود لے لے گی...... بچے کے طبی معائنہ پر اس میں فیکٹر نائن کی خطرناک حد تک کمی پائی گئی...... بچے کا باپ گھبرا کر یورپی خاتون کو یقین دلانے لگا کہ اگر وہ اپنے پیسے واپس نہ لے تو آئندہ نو ماہ کے اندر ہی وہ اسے ایک اور فسٹ کلاس بچہ پیدا کر دے گا......" دادا کو ادھر چند سال سے یہ عادت پڑ گئی تھی کہ کوئی بات سوچ سوچ کر ہی اسے معلوم ہونے لگتا کہ وہ اسے بیان کر چکا ہے۔

"رک کیوں گئے، ڈاڈو؟ وہ بات بتاؤ۔" مگر راہو دادا کی کمزوری سے واقف تھا، اس لئے اسے اپنے سوچ کے چکر سے نکالنے کے لئے اس نے فونی سی آواز میں کہا۔ "ہندوستانی کیا اسی لئے اپنی آبادی بڑھنے سے نہیں روکتے کہ بچے بیچ بیچ کر پیٹ پالتے رہیں؟"

"تم تو امریکی ہو بیٹا، جانتے ہی ہو، پیدا تو اسے ہی کیا جاتا ہے جو بک سکے۔ بیٹا یا باپ۔"

"یو آر ویری، ویری ناٹی، ڈاڈو!" انو نے دادا کے جواب پر قہقہہ لگایا۔ "جانتے ہو، آج کل میں اپنے پپا کے ساتھ کس پراجیکٹ پر کام کر رہی ہوں؟...... ہم چاہتے ہیں ہیومن

سپرمز اور اووا کو سالہا سال تک محفوظ کیا جاسکے، تاکہ بچے بہ ضرورت پیدا کئے جاسکیں، خواہ اسی وقت، خواہ ان کے ماں باپ کی موت کے سو سال بعد......"

"سو سال بعد؟!"

"ہاں، اور کیا؟"

"تو پھر ان کے ماں باپ کون ہوں گے؟......وہ خود آپ ہی؟"

"ناؤ بی ریشنل، ڈاڈو!...... جو بھی انہیں خرید لے۔"

"اور اگر کوئی خریدار نہ ہو؟"

"تو اس وقت انہیں پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ارے!" گاڑی کے باہر نظر دوڑا کر راہو نے پیچھے سے اپنی بہن کا کندھا جھٹکا۔ "ہم لیڈر پارک سے آگے نکل آئے ہیں۔"

"او مائی گاڈ!" انو نے جھٹکے سے گاڑی روک لی۔ "ڈاڈو کی باتوں پر کان دھر کر کس کے حواس بجا رہ سکتے ہیں؟" وہ گاڑی پیچھے موڑنے لگی۔

"نہیں، انو بیٹا!" دادا نے اسے جواب دیا۔ "تم امریکی اپنے پورے ہوش و حواس میں منزل سے آگے نکل آتے ہو۔ پتہ نہیں کہاں جانے کے لئے۔"

"تمہیں کہاں جانا ہے ڈاڈو؟"

"مجھے؟" دادا کی سمجھ میں نہ آیا کہ انو کو کیا جواب دے۔ "اور کہاں؟ میں تو دلی ہی جاؤں گا بیٹا۔"

"مگر ڈاڈو، وہاں پہنچ کر بھی تم اپنے بدن سے باہر کہیں تھوڑا ہی جا پہنچو گے۔"

اپنی پوتی کی ذہانت پر جھوم کر دادا نے اس سے کہا۔ "ہاں، کہیں جانا تو تبھی ہوتا ہے جب بدن سے باہر آجائیں۔"

"تو پھر جب تک اپنے بدن میں ہی ہو ڈاڈو، تمہیں کہیں بھی نہیں جانا ہے۔" پوتی نے اپنے دادا کی دادی بن کر اسے ہدایت کی۔ "پپا کہا کرتے ہیں، یو ڈونٹ نو ہاؤ سٹوپڈ دس گیم آف لائف از، بٹ اِٹ اِز انٹرسٹنگ بیکاز اِٹ اِز سٹوپڈ!"

(۲)

لیڈر پارک میں گاڑی پارک کر کے انو اور راہو نے خورد و نوش کا سامان اٹھایا اور اپنی

ماں اور دادا کو اشارہ کر کے یہ دیکھے بغیر کہ وہ پیچھے آرہے ہیں، آناً فاناً دور ایک موڑ پر جا پہنچے۔

"ٹھہرو، انو!" دادا کی بہو نے چلا کر کہا۔

"ڈاڈو کے ساتھ دھیرے دھیرے آجاؤ۔" راہو نے رک کر جواب دیا۔

وہ دونوں ہانپتے ہوئے ان کے قریب جا پہنچے۔

"مجھے اندر میدان کا راستہ معلوم نہیں۔" ایشا نے ذرا دم لے کر اپنے بچوں کو بتایا۔

"ہمیں بھی کہاں معلوم ہے ممی، دیکھ دیکھ کر جا ہی پہنچیں گے۔"

دادا کی بھٹکتی ہوئی نظر اچانک پہلو کی ایک خاردار جھاڑی کے عقب میں جا کر اٹکی جہاں دونوں جوان ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر اپنی بوسہ بازی میں مگن تھے...... دادا ٹھٹک کر انہیں گھورنے لگا تو راہو کی کھلنڈری آواز اسے کھینچ کر اپنے پیچھے لے آئی۔

"بیڈ مینرز، ڈاڈو! اپنی راہ چلتے آؤ۔"

"وہی تو کر رہا ہوں بیٹے، وہ آپ ہی سامنے آگئے ہیں......"

"تو آنکھیں بند کر لو۔" دادا کی پوتی نے مشورہ دیا۔

"مگر آنکھیں بند کر کے اپنی راہ بھی کیسے چلوں؟"

وہ ذرا آگے بڑھ آئے تو انو اسے بتانے لگی۔ "یہ گے لوگ ہیں ڈاڈو۔ ان کا قول ہے کہ جنس کا نشانہ نسل کی افزائش نہیں ہوتا۔"

"مگر بیٹی، جنسی عقدہ کھلتا تو اسی دم ہے جب بچہ پیدا ہو جائے۔"

"اوڈاڈو! یو آر اے......" وہ گویا بور کی متعاقب صفت ڈھونڈنے کے لئے رک گئی۔ "یو آر اے بگ ڈارلنگ بور! سمجھتے کیوں نہیں؟ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نسلی بڑھاوے کی للک سے جنسی رشتہ اوپرا رہ جاتا ہے۔"

دادا ٹھوکر کھا کر گرنے لگا تو راہو نے اسے فوراً سنبھال لیا۔

"ایک بات بتاؤں بیٹا؟......" دادا کو حسب عادت پھر صرف سوچ سوچ کر ہی لگ رہا تھا کہ وہ بول رہا ہے۔ "اگر یہ سب ہوتا تو میرا باپ مجھ سے اور میں تمہارے باپ سے اور تم اپنے باپ سے محروم رہ جاتیں، یعنی کوئی ہوتا ہی نہیں، یا ہوتا تو پتہ نہیں عدم کے ویرانوں میں کہاں اپنی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا......"

"ہیومن رائٹس، پپا!" دادا کی بہو نے اپنے سسر کو سمجھانا چاہا۔

"جو بھی جیسا چاہے کرے، سٹیٹ یا سو سائٹی کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟...... ارے! دیکھو، ہم آگئے!"

دونوں طرف اونچی اونچی باڑھ میں گھری ہوئی پگڈنڈی سے بر آمد ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک طویل و عریض سر سبز میدان کے کنارے کھڑے پایا۔ جہاں ایک وسیع چبوترا نما اسٹیج کے گرد و پیش بہت سے لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر بیٹھے تھے...... نہیں، کئی لیٹے ہوئے بھی تھے...... ڈرامہ شروع ہو چکا تھا مگر ابھی تک پہلے ایکٹ کے پہلے سین سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ڈیسڈیمونا کا باپ برابینشیو اسٹیج سے دہائی دے رہا تھا:

اوہیون! او ٹریژن آف بلڈ!

فادرز فرام ہینس ٹرسٹ ناٹ یور ڈاٹرز مائینڈز بائی واٹ یو سی دَیم ایکٹ۔

"نان سنس!" انو نے برابینشیو کی دہائی سن کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ "کیا یہ بڈھا پاگل ہو گیا ہے ڈاڈو؟" اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ڈائرکٹ کرنے لگی۔ "آؤ، بیٹھنے کے لئے پہلے کوئی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔"

میدان میں اترتے ہی چند قدم پر انہیں ایک چھوٹا سا ٹیلہ مل گیا جہاں بیٹھ کر ابھی انہوں نے ٹانگیں بھی نہ پساری تھیں کہ راہو نے تجویز کیا۔ "پہلے کچھ کھاپی لیا جائے۔

"مگر بیٹا، ڈرامہ......"

"وہ بھی ساتھ ساتھ چل ہی رہا ہے۔" اس نے امریکی سرعت سے، پہلے گھاس پر ایک فولڈنگ اسٹینڈ نصب کیا اور پھر بیگ سے خورد و نوش کی اشیاء نکال کر انہیں اسٹینڈ پر سجادیا۔ "ہاتھ بڑھاؤ، ڈاڈو۔" اس نے سب سے پہلے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بیف سینڈوچ ریزہ ریزہ اپنے حلق سے اتار کر پیٹ میں محفوظ کرنے لگا۔ "آپ کے وجیٹیرن سینڈوچ وہ رکھے ہیں ڈاڈو۔" اور پھر وہ اسٹیج پر سرسری سی نگاہ دوڑا کر اوتھیلو کے بارے میں پوچھنے لگا۔ "ڈاڈو، سبھی گوروں میں وہ اکیلا کالا کون ہے؟ کوئی امریکی نیگرو؟...... میں انو دیدی کو سمجھاتا رہتا ہیں، ان کالے ناگوں سے ہمیشہ بچ کے رہو۔"

"شٹ اپ!" انو نے اپنے بھائی کو ڈانٹا۔ "ناگ سفید رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔"

"سفید رنگ کے؟ کیا تم نے کبھی سفید رنگ کا ناگ دیکھا ہے، ڈاڈو؟ سفید رنگ کے ناگ کتنے خوبصورت ہوتے ہوں گے انو دیدی!"

"مگر دونوں کے زہر کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔" ایشا نے اپنی رائے دی۔ "مجھے تو بھورے، رنگ کے ناگ اچھے لگتے ہیں۔"

"کیاان میں زہر نہیں ہوتا، ممی؟" انو نے اپنی ماں سے استفسار کیا۔ "جو سانپ بے زہر ہوتے ہیں، زہر والے سانپ انہیں کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا ہے دیدی۔ اس سانپ کی شان ہی کیا جس میں زہر نہ ہو۔ ہے نا؟"

"میں تو سبھی مردوں کو زہریلے ناگ ہی مانتی ہوں۔" انو استعارے سے راست بیانی پر اتر آئی۔ "جو ازل سے عورتوں کو ڈستے چلے آرہے ہیں۔"

"ہماری دیدی یہاں فیمینسٹ کلب کی لیڈر رہے ڈاڈو۔"

"بھئی، پہلے مجھے اپنی دال اور ڈال کے چکر سے نکالو۔" دادا نے راہو سے پوچھا۔ "انو کو تم دیدی کہتے ہو اور مجھے ڈاڈو؟"

"کیوں کہ تم ڈاڈو ہو ڈاڈو، اور دیدی، دیدی۔"

"ہاں، واقعی، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ ایک بات بتاؤں؟ سکول میں میرے ساتھی مجھے ڈڈُو کہا کرتے تھے۔" دادا کے لہجے میں بڑی نرمی آگئی۔ "مجھے اچانک لگا ہے جیسے مجھے کسی بڑے پکے پرانے یار نے اتنے سال پیچھے سے آواز دی ہے۔"

"مگر میں تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں ڈاڈو۔" راہو نے اپنا سینڈوچ سٹینڈ پر رکھ کر دادا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "ڈاڈو، پھر کب آؤ گے؟"

"تمہاری شادی پر۔"

"شادی پر کیوں؟ شادی تو میری ہوگی۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پھر تم ہی چلے آنا۔"

"نو، ڈاڈو۔ میرا اسکول کا فائنل ائر ہے۔ اسکے بعد کسی یونیورسٹی میں داخلے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ اس کے بعد......"

دادا نے اپنا منہ اسٹیج کی طرف پھیر لیا جہاں ڈیسڈیمونا ڈیوک آف وینس کو مخاطب کرکے کہہ رہی تھی۔

مائی ہارٹ از سبڈیوڈ

ایون ٹو۔ داویری کوالٹی آف مائی لارڈ

آئی ساو تھیلو زوسیج اِن مائی مائینڈ

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"او تھیلو کی بیوی۔" دادا انہیں بتانے لگا۔ "او تھیلو اس سے از حد محبت کرتا ہے مگر تھوڑی دیر میں تم دیکھو گے کہ ایک ویلین اس کے کانوں میں زہر اگل کر کس طرح اسے اپنی نیک اور پاک بیوی سے بد ظن کر دے گا۔"

"نیک اور پاک!" انو نے اپنا تمسخرانہ قہقہہ روکنا ضروری قرار نہ دیا۔

"ہنس کیوں دی ہو، انو دیدی، ڈاڈو نے تو صرف کہانی سنائی ہے۔"

"نہیں، انو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔ مردوں کو اتنا ہی شوق ہے تو خود آپ ہی نیک اور پاک بن کر ساری عمر گھونگھٹ میں کیوں نہیں گزار دیتے؟"

"اری دیدی، وہ دیکھو میڈم بَیلی۔"

وہ سب راہو کی انگلی کی سیدھ میں دیکھنے لگے۔ وہاں اسٹیج کے قریب ایک ادھیڑ عمر عورت اپنے ایک ہاتھ سے شراب کے گلاس اور دوسرے سے ایک نوجوان کو دبوچے گھاس پر نیم دراز تھی۔

دادا کی بہو نے اسے بتایا کہ بیلی ایک بہت بڑے انڈسٹریل کامپلیکس کی واحد مالک ہے۔ "ایک بار ایک بزنس ڈنر پر امیر کے ساتھ ہمارے گھر بھی آئی تھی۔"

"وہ لڑکا کیا اس کا بیٹا ہے؟"

دادا کی بہو ہنس پڑی۔ "نہیں رکھیلا ہے۔ خوشحال عورتیں یہاں شوہروں پر تنخواہ دار مرد پراستی چیوٹوں کو ترجیح دیتی ہیں۔"

"ابھی تک پیپسی کیوں نہیں نکالا راہو؟"

راہو پیپسی کین نکال کر باہر رکھنے لگا۔ "مگر ڈاڈو، تمہارے لئے میں پپا کی خاص وِہسکی بھی اٹھا لایا ہوں۔ یہ دیکھو!" دادا کو بوتل دکھا کر اس نے ایک گلاس بھی نکال لیا اور اس میں وِہسکی انڈیلنے لگا۔

دادا نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "سوڈا بھی لائے ہو؟"

"ہاں، اور کیا؟ یہ دیکھو!" راہو وِہسکی میں سوڈا ملانے لگا۔

"ارے بھئی، ہم بھی صرف پیپسی کیوں پئیں؟" دادا کی بہو بولی۔

"مگر میں ایک ہی گلاس لایا ہوں۔"

"تو کیا ہوا؟ وہسکی کو پیپسی کین میں ہی ڈال دو۔"

"میرے میں بھی۔" انو نے تقاضہ کیا۔

"تو پھر میں اکیلا ہی کیوں رہ جاؤں؟"

"نہیں، راہو، بالکل نہیں!" راہو کی ممی نے ہدایت کی۔ "اٹھارہ سال کا ہونے میں تمہارے ابھی پورے ڈھائی ماہ باقی ہیں۔"

"نہیں، تم کچھ بھی کہو، آج تو لے کے ہی رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر تھوڑی سی۔"

راہو نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کا منہ چوم لیا۔ "میری وہ گرل فرینڈ ہے نا...... سِلی، اس نے مجھ سے کہا تھا، تم بہت خوش قسمت ہو راہو، میری ممی تو نری جیلر ہیں مگر تمہاری تمہیں سب کچھ کرنے دیتی ہے۔"

"کیا سب کچھ؟" دادا کی بہو نے گھبرا کر اسے پرے دھکیل دیا۔

"سب کچھ، یعنی سب ہی کچھ۔" وہ سبھوں کے پیپسی کے ڈبے کھول کھول کر ان میں وہسکی ملانے لگا۔

دادا نے اپنا وہسکی کا گلاس اٹھا کر اسٹیج کی طرف نگاہ اٹھائی جہاں کیسیو نشے میں اپنے ساتھیوں کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ نشے میں نہیں۔

دس از مائی رائٹ ہینڈ، اینڈ دس از مائی لیفٹ ہینڈ

دادا کا ابھی ستر واں سال بھی پورا نہ ہوا تھا مگر اس کے حواس بعض اوقات اچانک سلب ہونے لگتے تھے اور اسے سامنے کی بھی بجھائی نہ دیتی تھی، مثلاً اس وقت وہسکی کا ایک ہی گھونٹ اندر اترنے پر وہ اپنے ذہن پر زور ڈال ڈال کر سوچ رہا تھا کہ اپنا گلاس وہ دائیں ہاتھ میں لئے ہوئے ہے یا بائیں میں۔ اس نے جھلا کر ایک ہی ڈیک میں گلاس خالی کر دیا۔ "اور!"

"آہستہ پیو، ڈاڈو۔" انو نے اس کی طرف سرک کر اپنا بازو پیار سے اس کے کندھے پر ٹکا لیا۔ "ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہوں، بیٹا۔" شاید کیسیو کی لائن اس کے ذہن میں بدستور گونج رہی تھی۔ "یہ دیکھو، یہ میرا دایاں ہاتھ ہے اور یہ، بایاں۔" اور پھر وہ خود پر یہ واضح ہو جانے پر

مسرت سے چمک اٹھا کہ وہ اپنا گلاس دائیں ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔

انو نے وہسکی کی بوتل راہو سے لے لی۔ ”بس!“

”بس کیوں؟“

”اچھا، ڈاڈو، تھوڑی سی لے لو۔“

”تھوڑی سی کیوں؟“

واٹ وُڈ ڈا ایور ہیل بٹ بائی ڈِگریز۔

آئی آگو کے الفاظ کانوں میں پڑنے پر دادا سوچنے لگا کہ ہم تو بتدریج اور زیادہ بیمار ہوتے جا رہے ہیں اور اب مرض کے کلائمکس پر ہماری موت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

”ڈاڈو؟“ انو اسے بلا رہی تھی۔ ”میری سمجھ تو جواب دے رہی ہے۔“

”تم نے کوئی سوال ہی نہیں پوچھا تو جواب کیا دے گی؟“

”نہیں، ڈاڈو، میں پوچھ رہی ہوں، اگر تم دائیں ہاتھ میں گلاس پکڑے ہوئے ہو تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو جاتا ہے تم ٹھیک ہو؟“

دادا اپنی پوتی کے مستعد ذہن پر جی ہی جی میں خوش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر بولا۔ ”لوگ ایکٹروں کو کتنی بے دھیانی سے سن رہے ہیں۔“

اس کی پوتی نے اسے جواب دیا۔ ”امریکی صرف اپنے اصل کام کی طرف دھیان دیتے ہیں۔“

”وہ اصل کام ہے کیا؟“

”ارے!“ ایکا ایکی راہو نے اسٹیج کی طرف انگلی اٹھا کر ان تینوں کو مخاطب کیا۔ ”ادھر دیکھو!“

انہوں نے کیا دیکھا کہ ایکٹروں نے تماشائیوں کا کھیل زیادہ دلچسپ پا کر اپنا کھیل روک دیا ہے اور اسٹیج کے کنارے آ جمع ہوئے ہیں اور بڑی منہمک توجہ سے میڈیم بیلی کے تنخواہ دار رکھیلے کو اپنی مالکن کے پورے وجود پر ہانپ ہانپ کر گرتے اٹھتے، گرتے اٹھتے دیکھے جا رہے ہیں۔

اسی دوران بجلی میں شاید کوئی خرابی واقع ہو جانے پر بتیاں اچانک گل ہو گئیں اور دادا کی آنکھوں میں شیکسپیئر کے ڈرامے کا آخری سین گھوم گیا جس میں اوتھیلو دیوانہ وار بولے جا رہا ہے:

پٹ آوٹ دا لائٹ اینڈ دین پٹ آوٹ دا لائٹ۔

پرندے

کارگل

پہاڑیوں کی ایک کھونٹ میں دو لاشوں پر نظر پڑنے پر عبدل دبے پاؤں اُن کے قریب چلا آیا۔ ایک ہندوستانی فوجی تھا اور دوسرا پاکستانی مجاہد۔

دونوں کی بندوقیں اُن کے درمیانی فاصلے میں گری پڑی تھیں، مگر عبدل کو بندوقوں سے کیا غرض؟ بندوقوں سمیت کبھی پکڑ دھکڑ میں آجاتا تو فوج اُسے بھی کوئی مجاہد سمجھ کر دھر لیتی۔ سب لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے مگر اُس نے وہیں کہیں پہاڑوں کے اندر کسی مخفی شگاف میں آپناہ لی تھی اور اِسی مانند موقع ملنے پر لاشوں کی جیبوں سے کام کی جو شئے بھی اُس کے ہاتھ لگ جاتی، اللہ کا شکر ادا کر کے اُسے اپنی جیب میں محفوظ کر لیتا۔

مجاہد کی اندورنی جیب سے اُسے کسی بچے کی تحریر میں ایک چٹھی ملی، مختصر سی، طفلانہ تحریر کی اڑی ٹیڑھی شبیہہ پر مسکرا کر وہ اِسے پڑھنے لگا...... پیارے ابو، السلام علیکم، کل میرا جنم دن تھا، مگر کیا پتہ، تم کہاں چلے گئے ہو؟ اِس لئے میں اور امی سارا دن روتی رہیں......

برفیلی ہوا کی سائیں سائیں میں ٹھٹھر محسوس کر کے عبدل ہندوستانی فوجی کی جیبوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فوجی کی باہری جیب میں ہی اُسے ایک مُنی سی نہایت خوبصورت لڑکی کی تصویر ملی۔

بھولے بھالے چور کو حیرت ہونے لگی کہ مجاہد کی بیٹی کی یہ تصویر ہندوستانی فوجی کی جیب میں کیسے آگئی۔

پارکنسنز ڈیزیز[1]

بس ایک پل میں ہی ساری کہانی ہولی۔
وزیراعظم کا ذہن ایک دم ہڑبڑا اٹھا،
اور اُس نے چیخ کر اپنے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو رک جانے کی ہدایت کی،
مگر ہاتھ کو اُس کے ذہن کی ہدایت کی کیا خبر؟
ہاتھ جوں کا توں سوچ بورڈ کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔
وزیراعظم بے بسی سے بلک کر رو دیا۔
اور سوچ بورڈ پر بٹن دبتے ہی ایٹم بم برادر مزائیل منہ پھاڑ پھاڑ کر چنگھاڑتے ہوئے اپنی کمین گاہ سے نشانے کی طرف پرواز کرنے لگا۔

سرحدیں

کتنی عجیب، کتنی مانوس سوچ ہے!
کسی نوزائیدہ کو روتے ہوئے پاکر مجھے ہمیشہ یونہی لگتا ہے کہ وہ ایک دم وجود میں آکر پیدا نہیں ہو گیا، بلکہ بدستور یادوں میں گھرے کہیں پیچھے سے چلا آرہا ہے...... نہیں، اُسے کھل کر رو لینے دو......

بوڑھا؟...... ہاں، کوئی بوڑھا جب اپنی یادداشت کھو کر کشاں کشاں زندگی پاٹ رہا ہوتا ہے تو بھی مجھے یونہی لگتا ہے کہ اُس کے آگے کوئی کھڑا ہے اور اُس کا پرتپاک خیر مقدم کر رہا ہے...... نہیں، اُسے ہنستے کھیلتے جانے دو۔

---

[1] اس مرض کی حالت میں مریض کے ہاتھ پیر اُس کے دماغ سے بے واسطہ ہونے لگتے ہیں۔

کہاں

میں اپنے گائیڈ کے ہمراہ مریخ کے دارالخلافہ میں گھوم رہا تھا۔

"یہ ہمارا معبد ہے۔"

ہم دونوں اس معبد کے اندر چلے آئے جہاں بیسیوں لوگ کرۂ ارض کی طرف بازو پھیلائے خدا سے اپنی ننھی منی مسرتوں کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

"وہاں ہمارا خدا رہتا ہے" گائیڈ نے کرۂ ارض کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تعظیم سے اپنا سر جھکا لیا۔

"مگر وہاں تو ہم لوگ رہتے ہیں۔"

مگر میں سوچنے لگا کہ کرۂ زمین پر میرے بھائی اس وقت مریخ کی جانب ہاتھ اٹھائے خدا سے اپنی خوش حالی کی دعا مانگ رہے ہوں گے۔

خودکشی

وہ خودکشی کے ارادے سے اپنے آفس بلڈنگ کی چھت کے کنارے آ کھڑا ہوا،

اور............

نیچے سڑک پر نگاہ جما کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

اُس کی لاش کے اردگرد بیسیوں لوگ آ جمع ہوئے تھے۔

اور جب کئیوں نے اوپر چھت کی اور نظر دوڑائی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

موٹے موٹے

"اس وعدے کا کیا ہوا پیر و مرشد، کہ یوم حساب مرحومین اپنی سزا بھگتنے کے لئے از سر نو جی پڑیں گے۔"

"کیوں، اُس وعدے پر تو اُسی وقت عمل شروع ہو گیا جب پہلے پہل ماؤں کی کوکھ بھرنے لگی۔"

"مگر........."

"نہیں عزیزم، ہم اِسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ مرے ہوؤں کے کئے کا کفارہ کر سکیں۔"

"مگر........."

"اگر مگر مت کرو عزیزم۔ موٹے موٹے یہ سمجھ لو کہ ہم ہی مرتے ہیں اور ہم ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

نظارہ

میری محبوب نے آخری بار مجھ پر نگاہ ٹکائی، بس کوئی پل بھر، اور پھر اُس نے آنکھیں موند لیں اور میں نے اُسے کھو دیا۔

پھر؟

پھر یہ، کہ میں اُسے اِسی پل کے بے حساب طول و عرض میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بوڑھا ہو گیا، مگر مجھے اُس کا سراغ کہیں نہ ملا۔

اور پھر؟

پھر کیا؟ پھر مجھ میں چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی اور میں ڈھیر ہو کر رہ گیا اور میری آنکھیں آپ ہی آپ مندنے لگیں...... ہاں، آپ نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔ آنکھیں مندتے ہی میری جان میں جان آ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کھلی آنکھوں سے صرف دنیاء دکھتی ہے؟

ملن

میں نے اُس کی تلاش میں دو جہاں چھان مارے، پر وہ کہیں ہوتی تو ملتی۔

مگر ایک دفعہ جب مَیں تھک ہار کر سر جھکائے اپنے من ہی من میں اترے جا رہا تھا تو اچانک اُس کی آواز سن کر چونک پڑا۔

"بہت دیر کر دی؟" وہ لپک کر میرے پاس آ گئی۔

"مجھے یہاں اکیلی چھوڑ کے کہاں چلے گئے تھے۔"

پاداش

نہیں، ڈیوڈ، تمہیں یقین نہیں آرہا تو آج ہی لائبریری جا کر تسلی کرو۔ چند ہی صدیاں پہلے انسان صرف دو ٹانگوں پر چلا کرتا تھا...... ہاں بھئی صرف دو ٹانگوں پر۔ پھر کیا ہوا کہ اسپتالوں میں اچانک ایسے کیس آنے لگے کہ آدمی اپنی دو ٹانگوں پر چند لمحوں سے زیادہ کھڑا نہ رہ پاتا...... ڈاکٹر؟...... اِن مورکھوں کی چھوڑو۔ انہیں کچھ اور نہ سوجھی تو اِسے کوئی ہنگامی مرض سمجھ کر ٹال جانا چاہا، مگر ہوا یہ، کہ ایسے لوگوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا جو اپنے ہاتھوں کو بھی...... اپنی اگلی ٹانگوں کو وہ ہاتھ کہا کرتے تھے...... زمین پر ٹکائے بغیر کھڑے نہ رہ پاتے تھے۔

ہاں، ڈیوڈ، یہ خوش نصیب لوگ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ کوئی صدی پون صدی میں ہی انسانی آبادی کی بھاری اکثریت مزے سے چار ٹانگوں پر چلنے لگی۔ اب یہ حال تھا کہ جو بدستور دو ٹانگوں پر چلتے تھے اُن کے لواحقین اُن کے علاج کی خاطر ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگے پھرتے

، اور ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہ آپاتا تھا کہ بے چاروں کو اس عذاب سے کیونکر چھٹکارہ دلائیں.......... ہاں بھئی، ہوتے ہوتے یہ دو ٹانگیے اکادکا ہی رہ گئے۔ جہاں کہیں کوئی دکھ جاتا، سرکس والے اُسے گھیر گھار کر اٹھالے جاتے۔

پھر کیا، ڈیوڈ؟ اور کچھ عرصہ بعد کوئی ایک بھی نہ بچا جو ہمارے تمہارے مانند چار ٹانگوں پر نہ چلتا ہو.......... ہاں بھئی، ہمارے مذہبی پیشوا ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ خدا نے انسان کو اُس کے گناہوں کی پاداش میں دو ٹانگوں پر کھڑا کر رکھا تھا۔

خانہ خدا

میرے یہاں آنے سے پہلے میری ضعیف ماں میرے چھوٹے بھائی کے پاس رہا کرتی تھی۔ وہاں گردوارہ گھر کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا، سو وہ نہادھو کر ناشتہ کرنے سے پہلے بلا ناغہ متھا ٹیکنے گردوارے چلی جاتی، مگر میری رہائش دہلی کے ایک مسلمان علاقے میں تھی جہاں آس پاس کوئی گردوارہ واقع نہ تھا۔

چند روز تو میں دفتر جانے سے پہلے ماں کو اپنی گاڑی میں دور پار ایک گردوارے لے گیا، پھر وہ میرا دفتر میں اُن دنوں لیٹ پہنچے کا سن کر مجھ سے کہنے لگی۔ ''پتر، تم یہ تکلیف مت اٹھایا کرو۔''

''پھر تم اپنے واہگورو کے پاس کیسے جاؤں گی ماں؟''

میری سیدھی سادی بوڑھی ماں نے ذرا سوچ کر یہ اُپائے بجھایا۔ ''میں پڑوس کی مسجد میں ہی واہگورو کو متھا ٹیک آیا کروں گی۔''

جیون کھیل تماشہ

"میں سپنوں میں بہتر دِکھتا ہوں۔"

"مگر اِس وقت تو آپ ہو بہو میرے سامنے موجود ہیں۔"

"کیا سپنے میں بھی سب کچھ ہو بہو نہیں ہوتا؟"

"مگر پھر آنکھ کھلتے ہی سب کچھ ایک دم مٹی کیسے ہو جاتا ہے؟"

"ہاں بابا، جیسے آنکھ لگتے ہی ہم۔"

ماضی

پورے تیس برس بعد میں اپنے گاؤں جارہا ہوں اور ریل گاڑی کے صوتی آہنگ پر کان دھرے اُن دنوں کا خواب دیکھ رہا ہوں جو میں نے بچپن میں اپنے گاؤں میں بتائے تھے......رات گہری ہورہی ہے اور خواب گھنا...... میں گھنٹوں کی نیند کے بعد ہڑبڑا کر جاگ پڑا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ دن چڑھ آیا ہے اور گاڑی میرا گاؤں پورے تیس برس پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

مانیتا

بھگوان رام بچپن میں آکاش بھر چاند کے لئے روتے رہے اور بڑے ہو کر صرف گھر

بھر زمین[1] کے لئے
اور اذیت کوش لوگوں نے انہیں اپنی دونوں خوشیوں میں ناکام پاکر بھگوان مان لیا۔

کہانی

میں نے ندی کا پیچھا کرنا چاہا،
مگر کیسے کرتا؟
وہ تو بہ یک وقت اپنے آگے بھی تھی اور پیچھے بھی!
سو میں لاچار سا اسے چپ چاپ دیکھتا رہ گیا۔

چور

"کیا بھاؤ ہے؟"
انگور بیچنے والا غریب بچہ چونک پڑا اور اُس کے منہ کی طرف اٹھتے ہوئے ہاتھ سے انگور کے دو دانے گر گئے۔ "نہیں صاحب! میں کھا تو نہیں رہا تھا صاحب!"

میلے ملاقاتیں

ہاں، میں ہر ایک سے نفرت کرتا ہوں، ماں باپ سے، بھائی بہن سے...... دوستوں سے...... ہر ایک سے...... نہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ کسی سے نفرت مت کرو؟ نہ بابا، آپ کی بات مان لوں تو اکیلا ہو کر رہ جاؤں۔

---

[1] سیتا کو دھرتی کی بیٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔

کیا واقعی

یا حضرت، مرحومین جب ہمارے خوابوں میں آتے ہیں تو کیا واقعی آئے ہوتے ہیں؟"

"تو کیا واقعی نہیں آئے ہوتے، عزیزی؟"

"مگر یہ کیونکر ممکن ہے یا حضرت؟ وہ تو اپنا وجود کھو چکے ہوتے ہیں۔"

"اسی لئے تو خوابوں میں آتے ہیں، وگرنہ دو پیروں سے چل کر اُس وقت بھی کھٹاک سے آوارد ہوں جب ہم جاگ رہے ہوتے ہیں۔"

درس وہدایت

"نہیں، بیٹا، ہمیشہ کسی بزرگ کے نقش قدم پر چلو۔"

"بزرگ تو واپسی کی راہ اختیار کئے ہوتے ہیں بابا۔ میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ آتے ہی واپس ہو لوں؟"

نام وام

آپ نہیں سمجھے۔ میں شمبھو کی کہانی پہلے پہل سے شروع کر رہا ہوں۔ پہلے پہل سب کے سب مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے کا دُکھ سُکھ اِس قدر یکساں طور پر محسوس

کرتے تھے کہ کسی ایک کے درد اٹھتا تو سبھی بلبلانے لگتے۔ کسی کو یہ سوجھ ہی نہ پاتا کہ درد کسی اور کے اٹھا ہے۔ اور تو اور، کوئی مر بھی جاتا تو کسی کو خبر نہ ہو پاتی، آخر مرا کون ہے...... یہ بھی میں، وہ بھی میں اور میں بھی میں، سو میں تو جوں کا توں زندہ ہوں، پھر کوئی مرا کیسے؟

نہیں، اب بھی نہیں سمجھے۔ ارے بھائی، میں اپنے کال کی بات نہیں کر رہا، پہلے پہل کی...... سب سے پرانے کال کی بات کر رہا ہوں جب شمبھو کا کوئی نام نہیں تھا۔ ساری مصیبت اُس وقت شروع ہوئی، جب صدیوں بعد شمبھو کا نام شمبھو رکھ دیا گیا اور یوں وہ بے چارہ بس ایک اپنا آپ ہو کر رہ گیا اور اکیلا پڑ گیا۔

پچھتاوہ

شب کے اندھیرے میں وہ اپنے دل کے دروازے پر چوکس پہرہ دے رہی تھی کہ میں نے ایک ہی وار میں اُسے ڈھیر کر دیا اور بے دھڑک دروازے کے اندر داخل ہو کر اُس کے دل پر قابض ہو گیا اور کئی سال بے خطر حکمرانی کیا کیا۔

مگر سچ مانیے اب اُس کے دل کی ویران وسعتوں میں چہار سو صرف اپنے آپ کو ہی مسلط پا کر مجھے اکیلے پن پر رونا آ جاتا ہے اور بے اختیار خواہش ہونے لگتی ہے، کاش میں نے اتنی بے رحمی سے اُس کے دل پر قبضہ نہ جمایا ہوتا!...... کاش وہ بدستور زندہ ہوتی اور ہم دونوں اُس کے دل میں باہم آباد ہو جاتے!......

تامل

آج صبح سویرے میں جو نیند سے بیدار ہوا تو بستر سے اٹھ کر کیا پایا کہ میں کسی کو بھی دکھائی اور سنائی نہیں دے پا رہا ہوں، بیٹوں، بہوؤں، پوتوں، پوتیوں، نوکروں...... کسی کو بھی نہیں، سب کے سب مجھ سے قطعاً بے خبر اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔

میں اپنی لاٹھی گھسیٹ گھسیٹ کر کھانستے ہوئے سبھوں کو مخاطب کرتا رہا، مگر کسی نے سر اٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھا۔ آخر تھک ہار کر میں اپنے بستر پر لوٹ آیا اور منہ سر لپیٹتے ہوئے اپنی مرحوم بیوی کو یاد کرنے لگا کہ وہ کتنے چاؤ سے دن رات میرے آگے پیچھے منڈلاتی رہتی تھی۔

میں نے ابھی اپنی ٹھنڈی سانس پوری آدھی بھی نہ بھری تھی کہ یکبارگی میرے منہ سے ہنسی چھوٹ گئی...... مجھے بیتے ہوئے تو کئی سال ہو لئے ہیں، پھر یہاں کس لئے ٹھکانہ کئے ہوئے ہوں؟

اصل و نقل

میری ماں کو مرے پندرہ برس ہو لئے تھے۔

آج میں نے اُس کی تصویر دیکھی اور رنجیدہ ہو کر سوچنے لگا، تصویریں ہی اصل ہوتی ہیں جو رہ جاتی ہیں، ماں تو محض ایک گمان تھی جو گزر گئی۔

جنگ، جہاد وغیرہ وغیرہ

پہلے تو دونوں ملک ایک دوسرے کو دھمکاتے رہے اور پھر خوف اور شبہ کے عالم میں اس قدر بوکھلا گئے کہ ایک دم ہائیڈروجن بم سے لدے میزائل ایک دوسرے پر چھوڑ دئے۔

اور پھر؟

پھر آناً فاناً جہنم کے دروازے پر لاکھوں روحیں ہاہاکار مچاتی ہوئی آ جمع ہوئیں۔

''جہنم میں اتنی جگہ کہاں ہے مالک دو جہاں؟'' فرشتوں نے خدا سے فریاد کی۔

خدا نے حکم دیا۔ ''جتنی جگہ ہے، بس اتنے لے لو......''

''مگر جو باقی رہ جائیں، ان کو؟''

"باقی واپس بھیج دو، تاکہ وہ وہیں اپنا جہنم جیتے رہیں۔"

انکار

"اس نانہجار نے اپنے ماں باپ کو ماں باپ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"
"نہیں، بے چارے کا کیا دوش؟ کوئی اُس کا وہ کمپیوٹر ہی اُڑا لے گیا ہے جس میں اُس نے اپنی یادداشت محفوظ کر رکھی تھی......"

نیا آدمی

موت گھبرا گئی کہ وہ اُس کی جان کیسے لے۔ وہ تو میری آمد سے پہلے ہی مر چکا ہے۔
مگر وہ متعجب تھی کہ یکسر مر جانے کے باوجود مرحوم عین مین چل پھر رہا ہے۔
موت کو اپنے چمتکار پر سراسیمہ پا کر مرحوم کا سینہ فخر سے پھول گیا۔

آگے آگے

"نہ بھائی، نہ! کھلی ہوا میں سانس مت لو......
"کیوں؟ دم کیسے روکے رکھوں؟"
"کیا تمہیں معلوم نہیں؟ آج کل آلودگی سے ہوا میں زہر بھرا ہوتا ہے۔"
"تو کیا مضائقہ ہے؟ سانپ اپنے اندر زہر نہ بھرتے رہیں تو دم توڑ دیں۔"

بھوت بسیرا

یاالٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟ مہانگر کے گھر گھر، جہاں بھی قدم رکھو، گھر خالی پڑا ہوتا ہے۔ آخر سب سے سب گئے کہاں؟''

''ارے، اتنا بھی معلوم نہیں؟ سب کے سب ٹی وی کے ڈبے میں بند پڑے ہیں۔''

''پر......؟''

''ارے بھائی، بھوتوں اور جنوں کا زمانہ ہے۔ ڈبوں اور بوتلوں میں بند نہ پڑے رہیں تو جان پر بن آئے۔''

فارن ایکسچینج

سیٹھ دم نکلتے ہی عدم آباد کے کسٹمز میں دھر لیا گیا۔

کسٹمز آفیسر تعجب سے اُس سے پوچھنے لگا۔ ''سچ سچ بتاؤ، فارن ایکسچینج کا ڈھیر کیسے ساتھ لے آئے؟''

''ہم کیا چیج ہیں پھر شتوں کے راجہ'' سیٹھ اُسے عاجزی سے بتانے لگا۔ ''کے کچھ کر سکتے؟ پر بھو جانت ہیں ہم کو دھن دولت سے سچا پریم ہے۔ سو وہ ہمارے پریم بھاو سے پرسن ہو کر بولے، جاؤ تمھی ناتھ، اپنی آتما میں اپنا سارا دھن بھر کے لے جاؤ۔''

''پر بھو بے چارہ بھی کیا کرے۔'' آسمانی کسٹمز کا ایک رکن اپنے ساتھی کو سمجھانے لگا۔ ''فارن ایکسچینج کی کمی سے ہمارے ساری اسکیمیں ٹھپ پڑی ہیں۔''

واردات

ہاں، میری بھی ایک محبوبہ ہے...... نہیں، میں اُس کی شکل و صورت سے ناواقف ہوں۔ کیسے واقف ہو سکتا ہوں؟ سارا دن کام کاج سے تھک ہار کر لوٹتا ہوں تو کھاٹ پر گرتے ہی میری آنکھیں مند جاتی ہیں اور عالم خواب میں وہ مجھ سے آملتی ہے۔

ہاں، بلاناغہ آتی ہے۔ نامعلوم کس راستے میرے خواب میں گھس کر میرے پہلو میں آپڑتی ہے...... آج وہ ایسے دکھائی دیتی ہے اور آج ایسے، یا کون جانے، کیسے؟ مگر مجھے اُس کے چہرے مہرے سے کیا لینا ہے؟ وہ جو بھی ہے، ہے تو وہ خود آپ ہی۔ میری محبت میں کچھ اس مانند سدھ بدھ کھوئے ہوتی ہے کہ میری آنکھیں سدا کے لئے بھی مند جائیں تو وہ میرے ساتھ جوں کی توں پڑی رہے!

آنکھیں کھلنے پر؟...... آنکھیں کھلنے پر محبت تھوڑا ہی کی جاسکتی ہے...... نہیں، میرے بھائی، آنکھیں کھول کر تو صرف کام کیا جا سکتا ہے، جو سر توڑ کرتا ہوں۔

اور زور ڈالو

پاگلوں نے اپنے ساتھی سے کہا "ہاں، ہاں، دماغ پر زور ڈالو اور سوچ سوچ کر آگے کی بتاؤ۔"

پاگل نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر سوچا اور بولا "ہاں، یاد آیا...... پھر میں کسی دہشت گرد کی گولی سے اُسی دم ٹھنڈا ہو کر چلتی سڑک کی پٹری پر گر گیا اور گرے ہوئے مجھے دو دن سے بھی اوپر ہو لئے، مگر کسی نے مجھے وہاں سے نہ اٹھایا۔ آخر میں اپنی لاش کی بو کی تاب نہ لا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چونکہ بھوک سے میری جان نکلی جا رہی تھی، اس لئے سب سے پہلے میں نے کسی ریستوران کا رخ کیا اور پیٹ بھر کھانا کھا کر جو اپنی جیب ٹٹولی تو میرا بٹوا غائب تھا......"

"ہاں، ہاں، رک کیوں گئے؟ دماغ پر اور زور ڈالو۔"

پاگل نے اپنے ہاتھوں سے سر کو اور زور سے دبایا، پھر کہنا شروع کیا۔ "اسی دوران میں نے اخبار میں پڑھا کہ سرکار نے دہشت گردوں کی گولیوں سے کام آنے والوں کے ورثاء کو ایک ایک لاکھ روپیہ ادا کرنے کا طے کیا ہے۔ میں نے سوچا میں تو خود آپ ہی اپنا وارث ہوں، پھر میں ہی اپنی موت کے پیسوں کا دعوئی دار کیوں نہ بنوں۔ مگر سرکار نے مجھے میرے حق کے پیسے ادا کرنے کی بجائے اپنی لاش کو غائب کرنے کے الزام میں دھر لیا اور پھر جب کوئی ثبوت نہ ملا، تو یہاں تمہارے پاس پاگل خانے میں بھیج دیا......"

"ہاں، ہاں، دماغ پر اور زور ڈالو۔"

"اور زور ڈال کر کیا بتاؤں؟ میں نے لاکھ شکر کیا کہ پاگل ہو گیا ہوں، ورنہ سرکار کی دہشت کے باعث ایک اور موت مرنا پڑ جاتی۔"

ہیرو

میں اور کیا کرتا؟
ہمیں اپنے نئے فیچر فلم کے لئے چند نئے چہروں کی ضرورت تھی اور ہماری فلم کمپنی کے مالک آپا صاحب نے مجھ سے کہہ رکھا تھا، دوسرے کسی بھی رول کے لئے جسے چاہو رکھ لو، مگر فلم کا ہیرو میرا اپنا آدمی ہی بنے گا۔
آپا صاحب کا اپنا آدمی خصلتاً ولین تھا اور حالانکہ ہمارے فلم میں اس کا ہیرو بننا بالکل طے تھا، پھر بھی مجھے شاید ذہنی طور پر بدستور ہیرو کی تلاش تھی، یا کسے معلوم، کیا؟ میں نے کیا کیا کہ اپنی رو میں ایک ایسے نوجوان کو ولین کا رول سونپ دیا جو مجھے اپنے ہیرو کے مانند فطرتاً حساس، نیک طینت اور معصوم سا لگا۔
"مگر میں......" اس نوجوان نے جھجک کر شاید تامل کا اظہار کرنا چاہا۔
"میں ویں کیا؟" "میں جھلا گیا۔" جب تک پورے ولین نہیں بنو گے، تمہیں ہیرو کون مانے گا؟"

آج کے لوگ

ہاں، بھئی، ہاں میری موت واقعی ہولی تھی، مگر دیکھ لو، میرا دل کیسے دھائیں دھائیں دھڑکے جا رہا ہے۔
ہاں، اور کیا؟ پورے کا پورا مر چکا تھا مگر تم خود ہی دیکھ لو، جوں کا توں زندہ ہوں......

کیسے کیا؟ جیسے ہے، ویسے!...... جیتے جی جب میری دھڑکن میں خلل واقع ہوا تو ڈاکٹروں نے میرے سینے میں ایک پیس میکر (Pace Maker) فٹ کر دیا اور دعویٰ کیا کہ اب دم نکل جانے پر بھی میرا دل جوں کا توں دھڑکتا رہے گا، سو جو ہے سو ہے...... مر کھپ کر بھی...... کیا؟...... مر اکب...... کتنے احمق ہو بھئی! جو مر گیا اسے کیا پتہ، وہ کب مرا...... ہاں، بھئی، اب خدا کا ڈر کا ہے کو؟ مر کر خدا کے پاس تھوڑا ہی جانا ہے...... ہاں، اور کیا؟ اب تو سدا اپنے ہی پاس رہنا ہے...... ہہ ہہ ہا!...... ٹھیک کہتے ہو، اب تو صرف اسی نیک کام سے نجات وابستہ ہے کہ اپنی مشین نہ بگڑنے دو۔

غرقاب

میں ایک عرصہ سے ایک سمندری جہاز میں نوکری کرتا ہوں۔
پہلے پہل جب میرا سمندر سے رابطہ ہوا تو مجھے لگتا تھا میں اس میں ڈوب جاؤں گا۔
مگر اب مجھے لگتا ہے کہ سمندر ہی میرے اندر ڈوب گیا ہے۔

خواب و خیال

"جوگن"
"کہو بھائی!"
"تمہارے پپوٹے مندے مندے کیوں رہتے ہیں، جوگن؟"
"پیتم اندر رہو بھائی، تو استری گھر کے کواڑ بند رکھتی ہے۔"

عروج

ماحولیاتی آلودگی پر اپنی تقریر کے اواخر میں سائنس داں نے اپنا پیرایہ بیان غیر پیشہ ورانہ کرلینا چاہا۔ "دوستو، خدانے تو آسمانوں میں اپنی رحمت کی اوزون تعمیر کر رکھی تھی، کہ جہنمی روحیں ہماری دنیا میں اترنے کی راہ نہ پاسکیں، مگر ہمارے گناہ اور گندگی کی زہریلی گیسوں کے انبوہوں نے اوپر اٹھ کر اوزون میں، چہار سو سوراخ پیدا کردے۔......

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔" سامعین میں سے کسی نے پوچھا۔

"جو ہم کرنے کے عادی ہیں...... یعنی کچھ نہیں۔" سائنس دان مسکرانے لگا۔ "خدا نے اپنا حکم نامہ جاری کردیا ہے کہ جہنم کو اب ہماری دنیا میں ہی منتقل کردیا جائے۔"

یادداشت

جس زمانے میں اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا طے کیا تھا انہی دنوں کاذکر ہے کہ وہ اپنی پریشانی سے بے حال ہوکر یادداشت کھو بیٹھا۔

اور پھر اس کی بیوی جب اسے اسپتال میں دیکھنے آئی تو وہ پہلی نظر میں ہی اس پر دل وجان سے فدا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ میں تو اس عورت کو جنم جنم سے جانتا ہوں۔

کچا پن

"بابا تم بڑے میٹھے ہو۔"

"یہی تو میری مشکل ہے بیٹا۔ ابھی ذرا کچا اور کھٹا ہوتا تو جھاڑ سے جڑا رہتا۔

موجود

کیا مجال، کوئی جان پہچان والا مر جائے اور وہ اس کے جنازے میں شامل نہ ہو۔
مگر آج ہم اسی کا جنازہ لئے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں اور کسی نے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے مجھ سے حیرت سے پوچھا ہے، "تعجب ہے آج وہ نہیں آیا؟"

ایک طویل کہانی

آج بھی میرے ساتھ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔
آج بھی میرے ساتھ کچھ نہ ہوا۔

نقطۂ نظر

میں اندھا تھا۔

لیکن جب ایک برٹش آئی بنک سے حاصل کی ہوئی آنکھیں میرے ساکٹس میں جمادی گئیں تو مجھے دکھائی دینے لگا اور میں سوچنے لگا کہ غیروں کا نقطۂ نظر اپنا لینے سے بھی اندھاپن دور ہو جاتا ہے۔

کھٹکا

''کون؟''

امجد گھر میں چپ چاپ بیٹھا تھا کہ آواز سن کر اچھل پڑا۔

''آیا!''

وہ لپک کر دروازے کی جانب گیا مگر چٹخنی کھولتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر ایک بے بس سی مسکان آبیٹھی۔ میں بھی کتنا پاگل ہوں! اُسے مرے ہوئے تو ایک یگ بیت چکا ہے۔

گھر باہر

''اتنی بھیڑ میں بیٹھے ہو'' لڑکی گھبرا کر اُس سے پرے سرک گئی۔ ''سب دیکھ رہے ہیں۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''اسی لئے تو تمھیں یہاں لایا ہوں'' لیٹے لیٹے وہ اُس کے قریب گھسٹ آیا۔

"نئی نئی اِس مہانگر میں آئی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں یہاں ہمارے گھر اینٹ اور گارے کی بجائے بھیڑ ہی کے بنے ہوتے ہیں۔" اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "بھیڑ کی یہ چار دیواری ہمیں نصیب نہ ہو ڈارلنگ، تو ہم پرائیوٹ لائف سے محروم رہ جائیں۔ "آؤ، آرام سے لیٹ جاؤ۔"

مارکیٹ اکانومی

کمپنی کا منیجر اپنے خریدار اور اس کی بیوی کو شوروم میں لے گیا اور وہاں ایک کونے میں کھڑے روبو سے انہیں متعارف کروانے لگا۔

"ہاؤ ڈُو یو ڈُو، سر؟...... میڈم، ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

خریدار کی بیوی روبو کے مہذب آداب واطوار سے خاص طور پر متاثر ہوئی۔

"قیمت؟"

"پانچ لاکھ روپے میڈم۔" میڈم کو اس قدر متوجہ پا کر منیجر ڈھول کی طرح بجنے لگا۔ "میٹنے نینس پر زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپے مہینہ۔ آپ کے سارے گھریلو کام اتنی مستعدی سے انجام دے گا میڈم کہ آپ عش عش کرا ٹھیں گی۔"

"تو!" دولت مند خریدار نے بڑے روکھے لہجے میں اسے ٹوک دیا۔ "جب میں خالی ایک ہزار روپے مہینے پر خود آپ ہی ایک انسان کو روبو میں تبدیل کر سکتا ہوں تو آپ کے روبو پر پانچ لاکھ کیوں برباد کروں؟"

اکیسویں صدی

آپ کے بھائی بہن بھی تھے، بڑے دادا؟ ہاں، بڑے دادا پپا بھی کہتے ہیں۔ بیسویں صدی میں سب کے بھائی بہن ہوا کرتے تھے۔ میرے بھی بھائی بہن ہوتے تو ہم سارا دن

خوب کھیلا کرتے۔ ہاں، بڑے دادا، لڑتے بھی۔ مجھے لڑنا بھی اچھا لگتا ہے مگر کس سے لڑوں؟ گڑیوں سے؟...... ان سے لڑنا چاہتی ہوں تو وہ ویسے ہی چپ چاپ مسکرائے جاتی ہیں...... کیا، بڑے دادا؟...... آپ کے چچا، ماموں اور خالو بھی تھے؟...... چچا، ماموں اور خالو کیا ہوتے ہیں بڑے دادا؟...... نہیں دادا، مجھے کیا معلوم، کیا ہوتے ہیں؟ کوئی ہو تو معلوم ہو۔ میرے بھی چچا اور ماموں کیوں نہیں؟ ہاں کسی کے بھی نہیں، پر کیوں نہیں؟...... فیملی پلاننگ؟ فیملی پلاننگ کیا ہوتا ہے بڑے دادا؟

نہیں رحمٰن بابو

نہیں، رحمٰن بابو، سفید بال تو بہیتر کی بہاروں کا مژدہ لے کر آتے ہیں۔ بڑھاپے میں آدمی کے سر میں جو اُجالا ہونے لگتا ہے وہی بالوں میں بکھر بکھر کر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نہیں بابو، سفید بالوں پر شرمندہ کیوں ہوتے ہو؟ شادیانے بجاؤ......

بہ وجوہ

میں تم سے محبت کرتا ہوں، شیکھا۔

اچھا، بتاؤ، بھلا کیوں؟

کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

نان سنس! یہ کیا جواب ہوا؟

تم نہیں جانتیں شیکھا، بہ وجوہ صرف نفرت کی جاتی ہے۔

ڈیموکریسی

خدائی کورٹ میں ثابت ہو گیا کہ اچھے تو عمر بھر دوزخ بھگتتے ہیں اور بروں کو جیتے جی جنت نصیب ہو جاتی ہے، چنانچہ سبھی پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد خدا پر کرپشن کے چارج کو جائز تسلیم کر لیا گیا۔

مگر خدا تو واحد اپنی ذات ہے، اُسے الگ کر کے خدائی کورٹ اُس کی خدائی کو کسے سونپتی؟

آخر چھوٹے چھوٹے خداؤں نے اپنا ڈھول پیٹ پیٹ کر ایسا سماں باندھا کہ اور تو اور، خود خدا بھی چکر میں آ کر ایمان لے آیا اور اُس نے خود آپ ہی تجویز کیا کہ ساری خدائی کو اُن ہی کے سپرد کر دیا جائے۔

آئینہ

کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟

اُس نے ساری عمر خود کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گزار دی۔

مگر وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بھی کہاں رہا؟ آئینے میں ہر بار اُسے کوئی اور ہی دکھائی دیتا، تاہم وہ ہمیشہ سر جھٹک کر باور کر لیتا، اور کون؟ میں ہی تو ہوں۔

گھور بڑھاپے تک بھی اُس کی آئینے کی عادت نہ چھوٹی، مگر اب وہ اپنے جھریوں میں اَٹے ہوئے وجود کو آئینے کے سامنے بہ مشکل اکٹھا کر کے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا کہ وہ

جوان جہان آئینے میں کہاں کھو گیا۔

پھر ایک دن آئینے میں سے بڈھا اپنی کھانستی ہوئی بے صبر آواز میں بول اٹھا، آئینے میں سبھی کھو جاتے ہیں مورکھ۔ کل وَل میں بھی کہاں دِکھوں گا؟ بھوت کے بھوت گھور گھور کر دیکھتے رہ جاؤ گے۔

دعا

وہ کئی سال سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا اور نہایت مضمحل، اور اب لمبی تان کر سو جانا چاہتا تھا، اتنا گہرا، کہ آنکھ کھلنے میں نہ آئے۔

بالآخر خدا نے اُس کی سن لی۔

وہ بڑی گہری نیند سو گیا اور مٹی کا مٹی پڑا رہا اور اِس طرح اپنے گھور سپنوں سے کچی قبر پر پھول پھول بر آمد ہونے لگا۔

کھلونے

ہمارے منے کے پاس ڈھیروں کھلونے ہیں، مگر میں اُس کا سب سے پسندیدہ کھلونا ہوں۔

مجھے اپنی دو ٹانگوں پر کھڑے پا کر وہ بے اختیار ہنسنے لگتا ہے، جیسے کوئی عجوبہ دیکھ رہا ہو، اور مَیں جھٹ اپنے دونوں ہاتھ بھی زمین پر ٹکا کر اُس کا گھوڑا بن جاتا ہوں اور وہ اچھل کر میری پیٹھ پر آبیٹھتا ہے...... چل میرے گھوڑے چھک چھک پھک!......

منے کو تعجب ہے کہ دادا بیٹری کے بغیر ہی کیونکر اتنا تیز چلتا اور اتنے زور سے ہنہناتا ہے۔

جان

دونوں دشمن پڑوسی ملکوں کے سربراہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر بیک وقت اپنا اپنا ہاتھ نیوکلیئر میزائل کے بٹن کی طرف بڑھادیا۔

مگر بٹن دبانے سے عین پہلے دونوں کے ہاتھ نامعلوم کیونکر مٹی ہو کر رہ گئے اور اُن کے پیچ و تاب کے باوجود اُس وقت تک مٹی کے مٹی رکے رہے جب تک اُنہوں نے ٹھنڈے ہو کر ارادہ نہ بدل لیا۔

کیا مٹی میں بھی جان ہوتی ہے؟
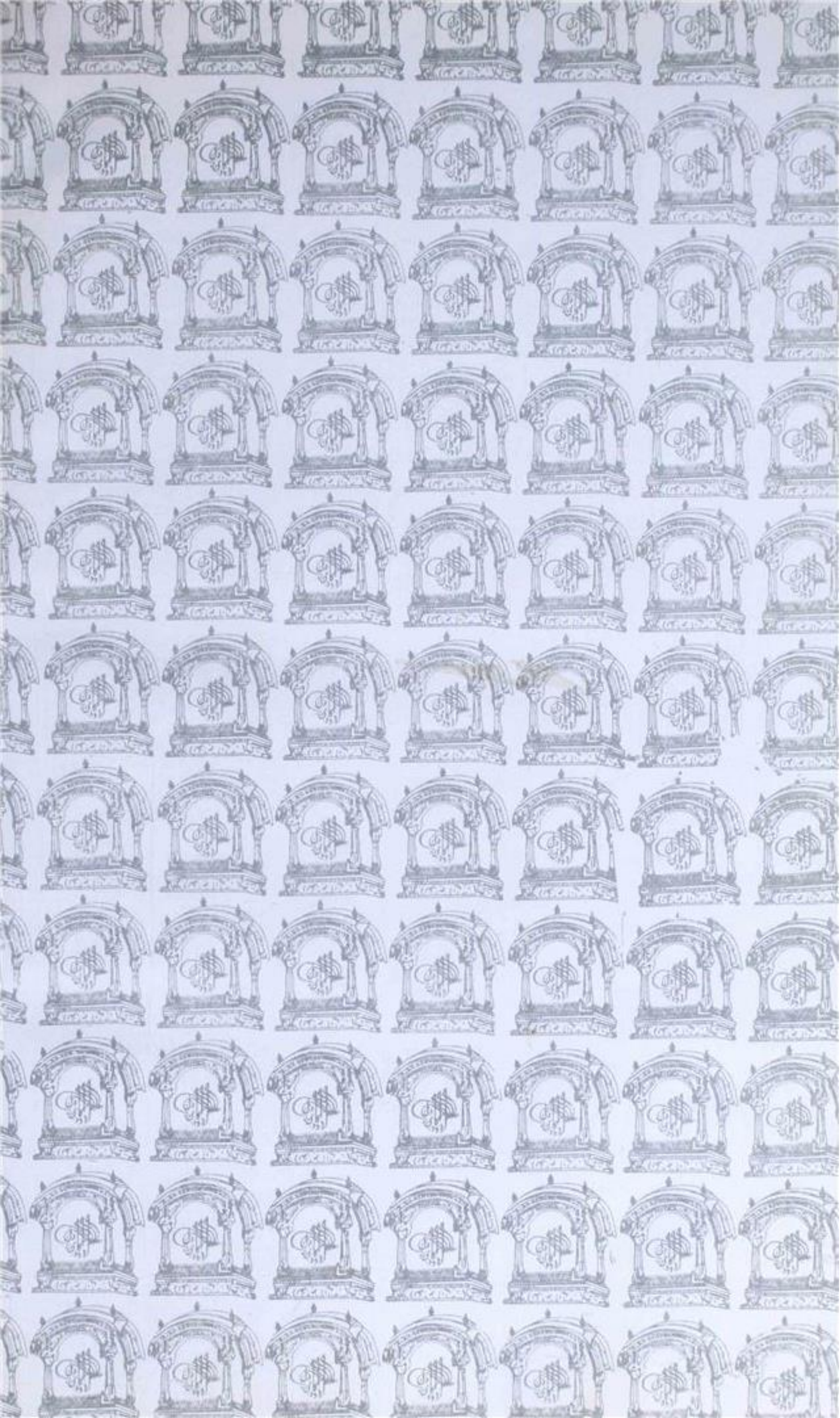
اُردو اکادمی دہلی

کی چند اہم مطبوعات

اردو کلاسیکل ہندی اور انگریزی ڈکشنری

مرتب: جان۔ٹی۔پلیٹس، صفحات: ۱۲۵۹، قیمت: ۲۵۰ روپے

دِلّی کا آخری دیدار

مصنف: سید وزیر حسن دہلوی، مرتب: سید ضمیر حسن دہلوی
صفحات: ۷۴، قیمت: ۲۰ روپے (تیسرا ایڈیشن)

داغ دہلوی حیات اور کارنامے

مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، صفحات: ۲۳۸،
قیمت: ۵۰ روپے (دوسرا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)

مرتب: سید مظفر حسین برنی، صفحات: ۱۲۰۸،
قیمت: ۱۵۰ روپے (چوتھا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد دوم)

مرتب: سید مظفر حسین برنی، صفحات: ۱۲۲۴،
قیمت: ۱۵۰ روپے، (تیسرا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم)

مرتب: سید مظفر حسین برنی، صفحات: ۱۱۶۸،
قیمت: ۱۵۰ روپے (دوسرا ایڈیشن)

کلیات مکاتیب اقبال (جلد چہارم)

مرتب: سید مظفر حسین برنی، صفحات: ۱۲۰۸، قیمت: ۲۵۰ روپے

سوانح دہلی

مصنف: شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی، مرتب: مرغوب عابدی
صفحات: ۶۴، قیمت: ۲۰ (چوتھا ایڈیشن)

عالم میں انتخاب دِلّی

مصنف: مہیشور دیال، صفحات: ۵۱۶،
قیمت: ۷۰ روپے (تیسرا ایڈیشن)

دیوانِ حالی

مقدمہ: رشید حسن خاں، صفحات: ۲۳۲،
قیمت: ۳۰ روپے (چھٹا ایڈیشن)

چراغِ دہلی

مصنف: میرزا حیرت دہلوی،
صفحات: ۵۳۶، قیمت: ۵۰ روپے (دوسرا ایڈیشن)

دلّی کی آخری بہار

مصنف: علامہ راشد الخیری، مرتب: سید ضمیر حسن دہلوی
صفحات: ۱۲۷، قیمت: ۲۵ روپے (چوتھا ایڈیشن)

اردو غزل

مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی، صفحات: ۳۵۹،
قیمت: ۵۰ روپے، (تیسرا ایڈیشن)

آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل

مرتب: پروفیسر عنوان چشتی، صفحات: ۳۸۴،
قیمت: ۶۵ روپے (تیسرا ایڈیشن)

آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ

مرتب: پروفیسر شمیم حنفی، صفحات: ۲۵۵،
قیمت: ۴۰ روپے (تیسرا ایڈیشن)

فوائد الفواد (حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات کا مجموعہ)

مرتب و مترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی، صفحات: ۱۰۸۸،
قیمت: ۱۰۰ روپے (چوتھا ایڈیشن)

ISBN: 81-7121-126-7